

استنے میں بالا اور راجہ بھی سپاہی کے ساتھ کمرے میں آ گئے۔ موسیٰ نے انہیں بھی غور سے دیکھا اس کے انداز میں کچھ ایسی دلچسپی تھی جیسے کوئی بزرگ اپنے خاندان کے چند شریر بچوں کو سرزنش بھی کر رہا ہو اور ساتھ ہی ان کی شرارت کا مزہ بھی لے رہا ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلو انوں کے انداز میں راجہ اور بالے کے شانوں پر زور ڈالا اور ہم سب کے بازوؤں کو نٹول نٹول کر دیکھا ”ہڈیاں مضبوطی سے بٹھائی ہیں اپنی اپنی جگہ پر تم سب نے۔۔۔۔۔ میرے حرام کے جنے تو لگتا ہے صرف روٹیاں ہی توڑتے رہے آج تک۔۔۔۔۔“ ہمارے لیے سارنگا کا یہ روپ بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ آخر اس نے ہماری مدد کے لیے اپنے خاص کارندے موسیٰ کو تھانے ہماری ضمانت کے لیے کیوں بھیجا تھا۔ جبکہ ہمارے خلاف اس بار استنے بڑے الزامات تھے کہ ہم آرام سے چھ چھ ماہ کے لیے جیل کی ہوا کھا سکتے تھے۔ اگر سارنگا کو ہم سے کوئی بدلہ لینا تھا یا ہمیں نشان عبرت بنانا تھا تو اس کے لیے ابھی اس کے پاس بہت وقت پڑا تھا۔ پھر ہمیں تھانے سے نکالنے کی اتنی جلدی کیوں؟ ہو سکتا ہے وہ اپنے حساب کتاب زیادہ دیر باقی نہ رکھنے کا عادی ہو؟

ہم جتنا سوچتے اتنا ہی مزید الجھتے رہے۔ جب ہم کیفے فراق کے قریب پہنچے تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ مرزا اور فراق چچا جا چکے تھے۔ ہم تینوں میں سے سب سے زیادہ مجھے گھر واپس جانے میں جھجک ہو رہی تھی، لیکن مجبوری تھی۔ گھر کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور ٹھکانہ بھی تو نہیں تھا۔ راجہ نے جدا ہونے سے پہلے مجھے اور بالے کو سختی سے تاکید کی کہ اب ہم تینوں میں سے کوئی بھی اکیلا کالونی سے باہر نہیں جائے گا۔ جب تک سارنگا کی نیت ہم پر پوری طرح کھل نہیں جاتی تب تک ہمارا تہا گھومنا بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسی ہی ایک غلطی کی سزا ہم مٹی کے ہسپتال میں پڑے گھائل جسم کی صورت میں بھگت رہے تھے۔

اپنی گلی میں پہنچ کر میرے قدم خود بخود دست پڑ گئے۔ میں نے جھجکتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے زمین سے دو چار نکر اٹھائے اور وقفے وقفے سے صحن میں اچھال دیے۔ کچھ ہی دیر میں صحن میں کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے کھلے دروازے سے چھوٹی نے جھانکا۔ اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی ”آیاں بھائی۔۔۔۔۔ آپ آ گئے۔۔۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور رہا ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں آپ کے لیے آپ کی چھوٹی کتنا روٹی ہے۔۔۔۔۔“ چھوٹی کے آنسو اب بھی ٹپکنے کے لیے تیار تھے۔ میں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی اور صحن میں داخل ہو گیا ”کیوں تمہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ صبح ناشتے کی ملائی کا ایک حصہ دار تو کم ہوتا نا۔۔۔۔۔ اب تمہارا اور اس پڑھا کو پروفیسر کا راج ہوتا سارے دسترخوان پر۔۔۔۔۔“ چھوٹی روتے روتے ہنس پڑی ”نہیں چاہیے اب مجھے اپنا حصہ۔۔۔۔۔ کل سے میں اپنا حصہ بھی آپ کو دے دیا کروں گی۔۔۔۔۔ بس اب آپ کہیں نہ جائیے گا۔۔۔۔۔ آپ چھٹ پر چلیں میں آپ کے لیے کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔۔۔۔۔“ میں نے ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ بابا کی سردی آواز گونجی

”وہیں رک جاؤ۔۔۔۔۔ اب تمہارا اس گھر پر کوئی حق نہیں ہے۔۔۔۔۔ تم کس منہ سے واپس آئے ہو۔۔۔۔۔ ہم سب کے چہرے پر کاک پوت کر۔۔۔۔۔“

امی ان کے پیچھے برآمدے میں لپکیں۔۔۔۔۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہ اپنے گھر نہ آتا تو اور کہاں جاتا۔۔۔۔۔؟“ ”ابا چلائے“ نہیں ہے

یہ اس کا گھر..... اس گھر کو اپنا سمجھتا تو اس کی عزت کا بھی پاس ہوتا اسے..... اخباروں تک شہرت پہنچ گئی ہے اس کی لوفز گردی کی..... لوگ بازار میں مجھے روک روک کر پوچھتے ہیں کہ یہ آیاں احمد آپ کا سپوت ہے جو شہر کے سب سے بڑے غنڈے سے الجھتا پھرتا ہے..... مطلب یہ تو اس غنڈے سے بھی بڑا غنڈا ہوا.....“

استنے میں ریحان بھی چھت سے نیچے اتر آیا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ رات دیر تک چھت پر میرے کمرے میں کھلی ہوا میں بیٹھ کر کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا تھا..... اس نے میری طرف داری کی ہمت کی..... ”نہیں ابا..... اب انوکو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے..... اب یہ آئندہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔“

ابا گرجے ”بس..... بہت ہو گیا..... خبردار جواب اگر کسی نے بھی اس کی طرف داری کی کوشش بھی کی..... پوچھو اس سے..... کیا میں نے اسے منع نہیں کیا تھا کہ اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے..... کیا میں نے اسے خود ہسپتال میں خاص طور پر یہ حکم نہیں دیا تھا کہ خود کو اس غنڈہ گردی سے علیحدہ رکھے..... لیکن اس نے ایک نہیں کئی بار پھر پورے خاندان کو رسوا کر دیا.....“

میں نے سراٹھایا ”انہوں نے ہمارے دوست کو موت کے منہ تک پہنچا دیا..... کل کو یہ سلوک وہ میرے یا ریحان کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں..... کیا تب بھی آپ.....“ ابا نے غصے سے کانپتے ہوئے میری بات کاٹ دی ”ریحان کو مت ملاؤ اپنے ساتھ..... یہ تمہاری طرح لوفز نہیں ہے.....“

گوایا ابا کو اس بات سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ کوئی مجھے مار کر پھینک جائے انہیں تو بس اپنے بڑے اور سعادت مند بیٹے کی فکر تھی۔ امی نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے اور وہ جلدی سے پولیس

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ریحان کے ابا..... دونوں بیٹوں میں فرق تو نہ کریں.....“ ابا امی کی طرف پلٹے ”اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے یہ فرق روا رکھنے کو..... کہو اس سے کہ اگر یہ ریحان کی طرح بننا چاہتا ہے تو آج سب کے سامنے تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے کہ یہ آئندہ اپنے ان آوارہ دوستوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ صرف اسی صورت میں میں اسے معاف کروں گا۔“

ابا کی بات سن کر سب ہکا بکا سے رہ گئے۔ دنیا کی سب سے کڑی شرط رکھی تھی انہوں نے مجھے معاف کرنے کی۔ ماحول پر سنانا سا چھا گیا۔ پھر میں نے ہی خاموشی توڑی ”ہم چاروں میں سے ہر ایک کے والد دوسرے تینوں کے لیے وہی خیالات رکھتے ہیں جو آپ کے ان کے بارے میں ہیں اور ہم میں سے ہر ایک خود کو باقی تین کی بدنامی کا باعث سمجھتا ہے۔ اگر میں ریحان کی طرح پڑھائی میں بہت زیادہ تیز نہیں ہوں تو اس میں ان تینوں کا نہیں..... میرا قصور ہے ابا..... اور پھر خدا نے ہر انسان کو الگ ذہن اور الگ استطاعت دی ہے، لیکن میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ آپ کے معیار پر پورا اتر سکوں، لیکن ہر طالب علم کا نصیب یا خواہش صرف سرکاری نوکری ہی تو نہیں ہوتی اور شاید میں کوئی بہت اچھا سرکاری نوکر بن بھی نہ پاؤں کیونکہ صبح نوے سے شام پانچ بجے تک کی پابندی میرے مزاج کے خلاف ہے..... شاید میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں..... شاید میرا نصیب اور خواہش کچھ اور ہو.....؟؟؟“

امی چھوٹی اور ریحان دم سادھے میری بات سن رہے تھے۔ کیونکہ زندگی میں پہلی بار میں نے ابا سے ایک ہی وقت میں اتنی لمبی اور سیدھی

بات کی تھی۔ ورنہ ہمارے درمیان نسلی فاصلہ کچھ اتنا طویل تھا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد صرف سلام دعا، ڈانٹ یا کسی ضرورت کے وقت میری ابا سے بات ہوتی تھی اور وہ بھی بذریعہ امی، چھوٹی یاریمان اور صرف مجھ پر کیا موقوف۔ مجھے تو لگتا تھا کہ ہمارے ملک کی نوے فی صد غریب اور اوسط درجے کی نوجوان نسل اپنے ماں باپ سے کھل کر اپنی بات نہیں کر پاتے۔ ابا کی سانس میری لمبی تمہید کے دوران پھرتی رہی۔ ”بہت خوب۔۔۔ تو آج تم نے اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ ٹھیک ہے۔۔۔ شاید ایک دن ایسا ہونا ہی تھا۔ تو تم اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔۔۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تم کرنا کیا چاہتے ہو۔۔۔ ساری زندگی سیکنڈ اور تھرڈ ڈویژن کے نمبروں سے بمشکل پاس ہونے والے کو ایسی کون سی چیلنج ہوگئی ہے لاکھوں روپے ماہانہ کمانے کی؟“

”مانتا ہوں کہ میں ساری زندگی بہت کم نمبروں سے کامیاب ہوا ہوں لیکن اس کی وجہ میری نالائقی سے زیادہ میری زیادہ نمبر لینے کی دوڑ میں شامل نہ ہونے کی خواہش بھی تھی۔ میں نے ہمیشہ 35 نمبروں کو ہی کافی سمجھا۔۔۔ کیونکہ میرے مضمون ہمیشہ آپ کے منتخب کردہ ہوتے تھے۔ آپ نے کبھی مجھے یہ سوچنے ہی نہیں دیا کہ میں خود کیا پڑھنا چاہتا ہوں۔ کیا بننا چاہتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں آج اپنے آپ کو ہی گم کر بیٹھا ہوں۔ میرا تعلیمی کیریئر اوسط درجے کا ہے اور میرے سامنے کوئی بڑی منزل نہیں ہے۔۔۔ مجھے چار پانچ گریڈ کی کسی سرکاری نوکری پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا جو میں کر نہیں سکتا۔۔۔“

امی نے بات بگڑتے دیکھ کر مجھے ڈانٹا ”انو۔۔۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔۔۔ اپنے ابا سے کوئی ایسے بات کرتا ہے۔۔۔؟“

ابا نے امی کو روک دیا ”نہیں کہنے دوا سے۔۔۔ اس کے اندر کا زہر باہر تو آئے۔۔۔ تاکہ تم سب کو بھی پتہ چل سکے کہ اس کے دل میں اپنے باپ کی کتنی عزت ہے۔۔۔ اب سنو آیان میاں۔۔۔ میں نے تمہاری سن لی۔۔۔ اس گھر میں اب تم اسی وقت رہ سکتے ہو جب اپنے باپ کو کچھ بن کے اور کچھ کر کے دکھاؤ گے۔۔۔ دوسری صورت وہی ہے کہ تمہیں یہاں رہنے کے لیے وہی سب کچھ کرنا ہوگا جو میں تم سے ہمیشہ کہتا آیا ہوں۔۔۔ اپنی تمام آوارہ گردی ترک کرو اور اپنے بھائی کی طرح اپنے باپ کا سہارا بننے کی کوشش کرو۔۔۔ نہ کہ اپنے بزرگوں کا نام یوں بازاروں میں اچھالتے پھرو۔۔۔ میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔۔۔“

میں نے حتمی فیصلہ کر لیا ”ٹھیک ہے۔۔۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو میں اس گھر میں تبھی قدم رکھوں گا۔۔۔ جب کچھ بن جاؤں گا۔۔۔ نہ بن سکا تو آپ کو اپنی صورت کبھی نہیں دکھاؤں گا۔۔۔“

امی حواس باختہ ہو گئیں۔۔۔ ”انو۔۔۔ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تیرا۔۔۔ ریحان۔۔۔ تو کچھ کہتا کیوں نہیں اپنے چھوٹے بھائی کو۔۔۔“ لیکن ریحان کی تو اپنی سیٹی گم تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑنے کے لیے میری جانب لپکا۔ چھوٹی روپڑی ”آیان بھائی۔۔۔ مت جائیں۔۔۔“ لیکن ابا چٹان کی طرح مضبوط کھڑے رہے۔ میں ریحان سے ہاتھ چھڑا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اندرا می اور چھوٹی رورو کو رابا کو دہائیاں دیتے رہے۔ لیکن ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تو قیر احمد کے اندر کا سخت گیر استاد آج اسے کسی دہائی کے سامنے تھکے نہیں دے رہا تھا۔ ریحان نے میرے پیچھے آنے کی کوشش کی تو ابا نے زور سے ڈانٹ کر اسے اندر بلا لیا۔



میرے دل و دماغ میں اس وقت آندھیاں چل رہی تھیں۔ ہم غریب لوگوں کی جیسیں کتنی خالی اور اناکتی بھری ہوئی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں اینٹ پتھر کی کوئی بھی دیوار انا کی دیوار سے بلند نہیں ہو سکتی۔ میرے اور ابا کے درمیان بھی آج وہی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔

میرے قدم ایک بار پھر اسی مہربان بیچ کی طرف بڑھتے گئے جو ہمیشہ سے کیفے فراق اور میری تہائیوں کا ساتھی تھا میں بہت دیر لیٹ کر آسمان کے تاروں سے پوچھتا رہا کہ اب کہاں جاؤں.....؟..... تارے مجھے دیکھ کر روتے رہے اور میرے سوالوں سے منہ چھپاتے رہے۔ جانے کتنی دیر بیت گئی اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کوئی موٹر میرے سامنے سے گزر کر آگے جا کر رک گئی ہے اور پھر اس میں سے کوئی اتر رہا ہے۔ میں اس وقت چونکا جب کسی نے میرا شانہ ہلایا۔ ”کیوں جوان..... گھر نہیں گئے اب تک“ وہ موسیٰ تھا ”گیا تھا..... لیکن ابا نے گھر سے نکال دیا.....“ موسیٰ نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”یہ ساری دنیا کے بزرگوں کو ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے کیا.....؟ اچھا چلو..... مالک تمہیں بلارہے ہیں.....“ میں نے بے دھیانی میں پوچھا ”کون“۔

”ارے بھائی رنگا بھائی..... اپنے مالک تمہیں بلارہے ہیں..... وہاں سامنے گاڑی میں۔“ میں زور سے چونکا..... ٹھیک اسی لمحے دور کھڑی کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک قدم نیچے اترنے کے لیے باہر نکلا۔



## کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔ اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم [kitaab\\_ghar@yahoo.com](mailto:kitaab_ghar@yahoo.com) پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود Ads کے ذریعے ہمارے پائرسز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپ کی یہی مدد کافی ہوگی۔ یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔

## باب 10

کار سے نیچے اترنے والا شخص سارنگا ہی تھا۔ لہذا تاجے جیسی تیز گندی رنگت، آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اور سرے کی دھار، بال سلیقے سے پیچھے کوالٹائے ہوئے، فراخ ماتھا، ہونٹوں میں دبا پان، مضبوط کسرتی بدن، دائیں ہاتھ کی کلائی میں تنگ پینٹل کا کڑا اور بائیں ہاتھ میں بہت قیمتی گھڑی، مہنگی بوکسی کا کرتہ اور سفید کلف والی لٹھے کی شلوار میں ملیں، بے خیالی میں اپنی مونچھوں کو تاد دیتے ہوئے وہ واقعی کسی چھوٹی موٹی ریاست کا سلطان محسوس ہو رہا تھا۔ میں موسیٰ کے ساتھ چلتے ہوئے نئے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو کار کے قریب پہنچ گیا۔ موسیٰ نے ہنستے ہوئے دور ہی سے سارنگا کو اطلاع دی..... ”کہتا ہے بابا نے گھر سے نکال دیا ہے..... ادھر بھی اپنی ہی کہانی ہے مالک.....“

موسیٰ کی بات سن کر رنگا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری ”تو تو سچ مچ نالائق تھا موسیٰ..... تجھے تو گھر سے نکال کر اچھا ہی کیا ہوگا تیرے ماں باپ نے.....“ پھر اس نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”تو کہے تو میں خود چل کر تیرے باوا سے بات کروں..... انہیں بتاؤں کہ ہمارا تجھ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ لہذا وہ تجھے معاف کر دیں.....“

”نہیں..... اس کی ضرورت نہیں ہے..... اور پھر آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر تو انہیں پورا یقین ہو جائے گا کہ میں.....“

میں کچھ کہتے کہتے رک گیا لیکن رنگا نے میری بات پکڑ لی تھی۔ اس نے زور کا قہقہہ لگایا اور موسیٰ سے کہا

”لے بھائی موسیٰ..... شہر میں صرف تو ہی اکیلا بدنام نہیں..... اپنا نام بھی شامل ہے اس افسانے میں..... ویسے لڑکا کہتا تو ٹھیک ہے..... اپنے تو قدم بھی جس چوکھٹ پر پڑ جائیں اسے دیمک مار جاتی ہے..... تو پھر تو ہی بتا کہ رنگا تیرے لیے کیا کر سکتا ہے..... تیرے لیے کہیں رہنے کا بندوبست کر دوں جب تیرے باوا راضی ہو جائیں تو واپس چلے جانا..... اور اطمینان رکھ..... کسی کو یہ پتہ نہیں چلے گا کہ یہ بندوبست رنگا بھائی کی طرف سے ہے۔“

”نہیں..... آپ کا بہت شکریہ..... میں کچھ کر لوں گا.....“

”جیسے تیری مرضی بھئی..... خوش رہ“ رنگا نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔

”چل بھئی موسیٰ..... ہماری نیا بھی پار لگا دے.....“ موسیٰ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کی جانب بڑھا۔ رنگا کار میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کھڑکی سے اندر جھانکا ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ہم سب کی ضمانت کیوں دی۔ ہم تو آپ کے دشمنوں میں سے ہیں۔“ سارنگا نے غور سے میری جانب دیکھا ”سارنگ کا دشمن زمین میں چھفٹ نیچے یا پھر چھفٹ اوپر ٹنگا ہوتا ہے ساجن..... اور وہ لونڈے لپاڑے میرے آدمی نہیں میرے آدمیوں کے در کر ہیں۔ گلیوں سے پیسے جمع کر کے اپنا گزارہ کرتے ہوں گے..... تو نے ٹھیک کیا ان حرام کے جنوں کے ساتھ..... کافی نام خراب کر ڈالا تھا انہوں نے رنگا کا بے فکرہ..... اب ان میں سے کوئی تیری راہ میں نہیں آئے گا۔ آئے تو کاٹ ڈالنا..... آگے رنگا

سنجبال لے گا۔۔۔۔۔

”لیکن آپ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں۔ میں تو آپ کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں ہوں۔۔۔۔۔“

رنگا نے اپنا سر جھٹکا۔۔۔۔۔ ”اسامیل کو تو جانتا ہے ناں۔۔۔۔۔ وہی حرام خور خبر لے کر آیا تھا تیری۔۔۔۔۔ چل اب اپنے دماغ کو زیادہ نہ تھکا۔۔۔۔۔ زیادہ سوال ہمیشہ چیزوں کو الجھا دیتے ہیں۔۔۔۔۔ جو گتھی جتنی کھل سکے۔۔۔۔۔ اسے اتنا ہی کھولا کر۔۔۔۔۔“ سارا رنگا نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی اور میں اپنے ذہن میں نہ جانے کتنی بند گتیاں لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔

اسامیل کا رنگا کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ اور اس نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ وہ رنگا کو جانتا ہے۔ میں صبح تک یونہی الجھا بیٹھا رہا، اور پھر جب فجر کے بعد مرزا اور پھر فراق چچا کینے پر آئے تو میری حالت جان کر پریشان ہو گئے۔ چچا فراق تو باقاعدہ غصے میں کھڑے ہو گئے۔

”لگتا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب سے آج تفصیلی بات کرنی ہی ہوگی۔۔۔۔۔“ اتنے میں راجہ اور بالا بھی آ گئے۔ انہیں بھی شاید ابا کے فیصلے کی کوئی سن گن مل چکی تھی۔ وہ مشی کے لیے ہسپتال ناشتہ لے جانے کے بہانے سے گھر سے نکلے تھے۔ راجہ جذباتی ہو گیا۔

”یارانو۔۔۔۔۔ اب ہم بھی اپنے گھروں میں نہیں رہیں گے۔ یہاں کسی کو ہماری فکر نہیں ہے۔“

مرزا نے انہیں ڈانٹا ”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ سب گھر والوں کو تمہاری فکر ہے۔ تبھی وہ تم لوگوں کو منع کرتے ہیں لیکن اس وقت انہیں تمہاری بات سمجھ نہیں آ رہی ہے۔۔۔۔۔ یہ جرنیشن گپ Generation Gap ہے پیارے۔۔۔۔۔ بھرتے بھرتے بھرے گا۔۔۔۔۔“ میں نے فراق چچا کا ہاتھ پکڑ کر بڑی مشکل سے انہیں روکا۔۔۔۔۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ اب ابا سے کوئی بھی اس معاملے میں بات نہیں کرے گا۔ وہ اپنی جگہ درست ہوں گے کہ ہر باپ ایک کامیاب اولاد کی خواہش رکھتا ہے، لیکن شاید وہ من چاہی کامیابی ہر اولاد کا مقدر نہیں ہوتی میں اپنی منزل اب خود تلاش کروں گا۔۔۔۔۔ کم از کم منزل نہ ملنے کی صورت میں بھٹک جانے کا الزام تو میرے سر ہی رہے گا نہ۔۔۔۔۔؟“ وہ سب خاموش ہو گئے ہم کچھ دیر کے لیے مشی کے پاس ہسپتال بھی گئے۔ اسے گھر والوں سے خبر مل چکی تھی کہ اس کا یہ حال بنانے والوں کو ہم نے کسی دوسرے ہسپتال کے بستروں کی زینت بنا دیا ہے۔ وہ ہمارے لیے بہت فکر مند تھا۔ ”انویار۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔۔۔۔۔ اگر تم لوگوں کو کچھ ہو جاتا تو۔۔۔۔۔“ راجہ نے لمبی سی انگڑائی لی۔۔۔۔۔ ”ہو جاتا تو ہم تینوں بھی اسی وارڈ میں پڑے ہوتے اور اس سرکاری ہسپتال کی خوبصورت نرسوں کو بار بار بہانے سے بخار چیک کروا رہے ہوتے۔“ مشی نے نکلیہ اٹھا کر اسے مارا ”تم کبھی نہیں سدھرو گے۔“

ہسپتال سے نکلنے کے بعد میں نے راجہ اور بالے کو ان کے گھر جانے کا کہا۔ وہ دونوں بیک وقت بولے ”لیکن اس وقت تم کہاں جاؤ گے۔۔۔۔۔؟“

”میں کچھ دیر کے لیے شیخ صاحب کی طرف جانا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ شام ہونے سے پہلے مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔۔۔۔۔“

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا ”اوہ۔۔۔۔۔ تو گویا شیخ صاحب کے ہاں ڈیرہ ڈالنے کی ٹھانی ہے جناب نے۔۔۔۔۔ ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ اپنے آباؤ اجداد کا ایک سسرال سادات محلے میں بھی ہے۔۔۔۔۔“



”حکومت..... تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ان کے گھر رہنے کے لیے جا رہا ہوں.....؟ وہ بہت پریشان تھے۔ انہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ رنگ والا معاملہ ختم ہو گیا ہے۔“

جاتے جاتے راجہ نے ایک جملہ اور پھینکا ”کچھ بھی کر لینا آیا ان پیارے..... پر کہیں گھر داماد بننے کی ہامی نہ بھرتا“ میں نے انہیں گھور کر دیکھا لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کالونی کی طرف بڑھ چکے تھے۔ میں سادات محلے میں شیخ صاحب کی گلی میں پہنچا تو سورج سر پر آچکا تھا اور چند لمحوں پہلے تک سکون سے دھڑکنے والا میرا دل اس وقت کچھ اس طرح سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے چند ہی لمحوں میں پسلیوں کی حوالات توڑ کر باہر آگرے گا۔ ہمیشہ کی طرح گہنا کا سامنا کرنے کا سوچ کر ہی میری سانسیں تیز اور گلا خشک ہونے لگا تھا۔ لاکھوں کی بھیڑ میں کوئی ایک چہرہ ہماری اندرونی حالت کو ایسے عکس کیسے بدل سکتا ہے.....؟ میں یہ راز کبھی جان نہیں پایا تھا۔

دستک پر دروازہ ستارہ نے کھولا۔ میں نے شیخ صاحب کا پوچھا تو وہ کہیں کام سے نکلے ہوئے تھے، تنویر بھی اپنے کالج کی نوکری کو جا چکا تھا۔ میں نے باپوس ہو کر واپسی کے لیے قدم تو لے۔

”ٹھیک ہے تو پھر آپ شیخ صاحب کو میرا پیغام دیجئے گا کہ آیا ان سے ملنے آیا تھا۔ میں پھر حاضر ہو جاؤں گا.....“

دروازے کی اوٹ سے ستارہ کی لپکتی سی آواز ابھری.....

”آپ اندر آ جائیں..... ابا کچھ دیر میں آ جائیں گے.....“

میں ذرا جھجکا ”لیکن اس وقت گھر میں کوئی مرد.....“

”آپ غیر تو نہیں ہیں..... ابا کو اگر پتہ چلا کہ ہم نے آپ کو یوں دروازے سے لوٹا دیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ میں بیٹھک کا دروازہ

کھلواتی ہوں..... آپ وہاں بیٹھ کر ابا کا انتظار کر سکتے ہیں.....“

ستارہ مزید کوئی بات سننے بغیر اندر چلی گئی اور پھر کچھ دیر کے بعد اندر برآمدے سے اسی کی آواز دوبارہ ابھری

”اندر آ جائیں.....“

میں اندر داخل ہوا۔ صحن میں آگے برآمدے میں بیٹھک کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ ستارہ وہیں برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں کھڑی رہی اور

میں بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد شیخانی جی اندر آئیں اور سلام کے جواب میں وعدہ کر مجھے بیٹھنے کا کہا۔ وہ کافی پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔

”کل مرزا صاحب ملے تھے انہیں..... انہوں نے بتایا کہ تم لوگوں کا پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے ان بد معاشوں سے، آیا ان بیٹا میری مان تو اس

معاملے کو ہمیں ختم کر دو، ان کا تو کام ہی تھا نہ کچھری ہے، لیکن تمہارے بوڑھے والدین شاید زیادہ دیر یہ سب کچھ سہہ نہ پائیں۔“

”جی..... ایسا ہی ہوگا..... آپ بے فکر رہیں.....“

”جیتے رہو..... تم بیٹھو میں تمہارے لیے شکسجین بنوا کر بھیجتی ہوں..... شیخ صاحب قریبی ڈاک خانے تک گئے ہیں۔ بس آتے ہوں

گے.....“ شیخانی بھی اٹھ کر اندر چلی گئیں اور ان کے اٹھنے ہی درمیانی پردے کے پیچھے سے ہلکی سی کھنکھرائی دی۔ میرا من ڈول سا گیا۔ وہ گہنا ہی تھی

”جناب آیان صاحب..... آج آپ ایک بات تو بتائیں..... یہ ساری دنیا میں ایک آپ ہی ہیں جسے سب سے زیادہ غصہ آتا ہے؟“ مجھے اس کے انداز پر ہنسی آگئی ”کیوں..... آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“ وہ واقعی غصے میں تھی ”اس لیے کہ غصہ کسی اور کو بھی آسکتا ہے۔ آخر آپ ہم سب کو اتنا پریشان کیوں کرتے ہیں؟..... آپ کو ابانے پہلے بھی کہا تھا نا کہ ان لڑکوں کے منہ نہ لگیں..... لیکن آپ نے تو کسی کی بات بھی نہ ماننے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ شاید.....“ گہنا پردے کے پیچھے ہی سے یہ ساری باتیں کر رہی تھی مگر میں اس کے تلخ چہرے پر غصے کے آثار اور اس کی شریر لٹ کی بار بار کی پریشانی یہاں سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ ”معافی چاہتا ہوں..... لیکن مجھے خبر نہیں تھی کہ کوئی میرے لیے اتنا پریشان ہے۔“ میرے شرارت بھرے جواب پر وہ مزید جزبہ ہو کر رہ گئی ”یہی تو آپ کا مسئلہ ہے..... آپ کو کبھی کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ ستارہ آپ ابھی آپ سے بے حد ناراض ہیں۔“

”اچھا چلیں..... جھگڑا ختم کریں اور اپنی ستارہ آپنی سے پوچھ کر کوئی ہرجانہ طے کر دیں..... میں بھرنے کے لیے تیار ہوں.....“

اس کی چوڑیاں کھٹکیں ”ہرجانہ تو آپ کو ضرور بھرنا پڑے گا۔ تیار رہیں گے گا، اور ستارہ آپنی کو آپ سے کچھ کام بھی ہے..... وہ بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا.....“ اتنے میں دروازے پر کچھ آہٹ ہوئی اور شیخانی جی خود ہی شربت کی ٹرے لیے اندر داخل ہوئیں۔ پردے کے پیچھے خاموشی چھا گئی۔ میں نے جلدی سے ٹرے تھام لی ”ارے..... آپ نے کیوں زحمت کی.....“

..... ”زحمت کیسی بیٹا..... ستارہ نے میری مدد کی ہے..... وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے لیکن شیخ صاحب کے سامنے اسے جھجک ہوتی ہے۔ تمہارے پاس وقت ہے تو ذرا اس کی بھی سن لو.....“ میں ہڑبڑاسا گیا ”جی جی..... ضرور۔“ شیخانی جی نے ستارہ کو آواز دے کر اندر بیٹھک میں ہی بلوایا۔ وہ جھجھکسی ہوئی سی اندر آئی اور سٹ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ شاید غم اور یاس کا پیلے رنگ سے کوئی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ تبھی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی چار سو پیلا ہٹ سی چھا گئی۔ اس کی پلکیں جھلکی ہوئی اور لب نیلگوں سے تھے۔ ستارہ نے مجھ سے کہا۔ ”میں ایم۔ اے فائنل میں تھی کہ اسے پڑھانی چھوڑنی پڑی۔ شادی کے بعد تعلیم مکمل کرنے کا ارادہ تھا لیکن حالات نے اس بات کی مہلت ہی نہ دی، لیکن اب وہ محسوس کرتی ہے کہ اسے بڑے بھائی کی غیر موجودگی میں باپ کا سہارا بننا چاہئے۔ تو میرا اپنے طور پر تو ہر خاطر داری کرتا ہے مگر ایک تنخواہ میں وہ اتنے لوگوں کا بوجھ کیسے اور کب تک اٹھاپائے گا۔ جو جائیداد اور مال متاع تھا وہ سب سیلاب بہا کر لے گیا۔ ان کا بڑا بھائی صغیر اپنے علاقے میں حکومت کی جانب سے کسی امداد کے انتظار میں بیٹھ بیٹھ کر سوکھ چکا ہے لیکن وہاں سے بھی کچھ ملنے کی امید نظر نہیں آتی۔ اس لیے گھر کا خرچ بانٹنے کے لیے اس نے کچھ کام کرنے کی ٹھانی ہے۔ تو میرے ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ مروت میں کبھی یہ ہونے نہیں دے گا۔ لہذا اگر میری نظر میں کوئی بھی سلائی کڑھائی کا یا اس سے ملتا جلتا کوئی بھی ایسا کام ہو تو میں ستارہ کو ضرور مطلع کروں۔“ میں چپ چاپ ستارہ کی بات سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس نازک سی لڑکی کی مدد کیسے کروں۔ میں اسے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ یہ زمانہ گدھ کی نظر رکھتا ہے اور اس جیسی شفاف دامن ہستی کے سفید کورے دامن پر داغ لگانے میں یہ سماج ذرا سی دیر بھی نہیں کرے گا۔ عورت جتنی محفوظ اپنے گھر کی چار دیواری میں ہوتی ہے اتنی محرم شاید کسی مسجد مندر میں بھی نہ ہو۔

اچانک میرے ذہن میں ایک کونسا سا لپکا ”آپ ٹیوشن کیوں نہیں پڑھاتیں ہمیں گھر پر۔ اس طرح آپ کو گھر سے باہر بھی نہیں نکلنا پڑے گا اور آپ گھر کے خرچے میں ہاتھ بھی بٹا سکیں گی۔“



”ہاں میں نے تنویر بھائی سے ٹیوشن کی بات بھی کی تھی۔ مگر اتنے دن گزر گئے کام نہیں بنا۔۔۔۔۔ دراصل آج کل طالب علم خود چل کر جانے کے بجائے استاد کو گھر بلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔۔۔۔۔ میں دوسروں کے گھر جانے کو بھی تیار ہوں مگر کوئی بات بنے تو سہی۔۔۔۔۔“

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں دو ہزار روپے کی ایک ٹیوشن لے رہا ہوں لیکن شاید اب جاری نہ رکھ پاؤں۔۔۔۔۔ میں وہاں آپ کی بات چلاتا ہوں۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ وہاں کیوں۔۔۔۔۔ وہاں تو آپ خود ہی پڑھائیے۔۔۔۔۔ ایسا کچھ بھی ہرگز نہ کیجئے گا۔۔۔۔۔ ہم پر آپ کے پہلے ہی بہت احسانات ہیں۔۔۔۔۔“ ستارہ کی بات ادھوری رہ گئی اور باہر کے دروازے پر دستک ہو گئی۔ شیخ صاحب واپس لوٹ آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کا چہرہ کھل سا گیا ”اُخا۔۔۔۔۔ اپنے آیان میاں آئے ہیں۔۔۔۔۔ بھئی بڑی راہ دکھائی تم نے۔۔۔۔۔“ ستارہ ان کے بیٹھک میں آنے سے پہلے ہی واپس اندر جا چکی تھی۔ میں نے تنہائی ملتے ہی وہ لفظوں میں شیخ صاحب کو ابا کی ناراضگی کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی کہ شاید اب میں واپس اپنے گھر نہ جاؤں۔ ساتھ ہی میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی کہ جب بھی اس بات کا ذکر اپنے گھر والوں کے سامنے کریں تو ان کی پریشانی کو مد نظر رکھتے ہوئے بات کا اسلوب کچھ ہلکا رکھیں۔ آس اور امید ہی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے۔ بری سی بری خبر بھی امید و آس کی پٹی میں لپیٹ کر سنائی جائے تو انسان بہل جاتا ہے۔ میں کچھ دیر شیخ صاحب کے پاس بیٹھنے کے بعد اجازت لے کر اٹھ آیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے برآمدے میں شیخانی جی کو خدا حافظ کہنے کے لیے رکا تو ان کے عقب میں چھپی گہنا نے شیخ صاحب سے نظر چرا کر جانے اشارے میں مجھ سے کیا کہا، لیکن اس کے ہلتے لیوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے ستارہ کا کام یاد دلوا رہی ہے۔ یہ لڑکی کس طرح میری آنکھوں سے بنا اجازت میرے دل کے بند کواڑوں کو توڑتی ہوئی اندر گھسی جا رہی تھی۔ کیا محبت کی لہروں کو روکنے والا کوئی بندہ نہیں ہوتا؟ شیخ صاحب نے دروازے سے نکل کر گلی میں پلٹتے وقت میرا ہاتھ تھام لیا ”یقین کرو آیان میاں۔۔۔۔۔ یہ میرا اپنا گھر ہوتا تو کبھی تمہیں واپس نہ جانے دیتا آج۔۔۔۔۔ تمہیں کبھی یوں در بدر بھٹکنے نہ دیتا، لیکن تم جانتے ہو میں خود یہاں مہمان ہوں۔۔۔۔۔“ میں نے انہیں تسلی دی ”آپ دل پر بوجھ نہ لیں۔ رشتوں کو کبھی خود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ اور آپ میری فکر نہ کریں۔۔۔۔۔ اب تو جب تک ابا مجھے ہفتے میں ایک بار گھر سے نکال نہ دیں مجھے خود اپنا گھر بھی اجنبی سا لگنے لگتا ہے“ شیخ بھی میرے ساتھ ہی مسکرا پڑے۔ انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”مجھے تمہاری یہ بات سب سے زیادہ پسند ہے۔۔۔۔۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں آیان میاں۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں کبھی ہار ماننے نہیں دیکھا۔۔۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔۔۔“ میں کیفے فراق پہنچا تو مرزا نے بتایا کہ اسماعیل دوبار آ کر میرا پوچھ چکا ہے۔ اسماعیل سے تو میں خود بھی ملنے کے لیے بے چین تھا، لیکن وہ مجھے کیوں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس سوال کے جواب کے لیے مجھے پورے چار بجے تک انتظار کرنا پڑا۔

اور پھر ٹھیک چار بجے اسماعیل کی گاڑی سڑک کے کنارے مڑتے دیکھ کر میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

اسماعیل کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی میں کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اسماعیل نے گاڑی بڑھادی ”کہاں تھے تم آیان بابو۔۔۔۔۔ سارا شہر ڈھونڈ لیا تمہارے پیچھے۔۔۔۔۔“

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم سارا گنا کو جانتے ہو؟“ اسماعیل مسکرایا ”مجھے کب پتہ تھا کہ تم لوگوں کا جھگڑا شوکی پارٹی سے ہوا ہے۔ ورنہ

پہلے ہی یہ قصہ نہٹ جاتا۔ میں سمجھتا رہا کہ یہ محلے کے اندر کی کوئی لڑائی ہے۔ وہ تو بھلا ہومرز کا جس نے مجھے اصل بات بتائی۔۔۔۔۔ ورنہ تم تو کچھ بتاتے ہی نہیں۔۔۔۔۔“

میں نے اسماعیل کی طرف غور سے دیکھا۔

”تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا..... تم سارنگا کو کیسے جانتے ہو..... اور وہ صرف تمہاری سفارش پر ہمارے خلاف اپنے ہی کارندوں کی درج کرائی گئی شکایت واپس لینے پر کیسے تیار ہو گیا؟.....“

اسامیل نے گاڑی ایک طرف روک دی۔

اسماعیل نے گاڑی ایک طرف روک دی۔

”سارنگا بھائی ہی میرے مالک ہیں۔ میں انہی کا دن کا ڈرا نیور ہوں اور انہوں نے میرے کہنے پر نہیں بلکہ ناہید بیٹا کے کہنے پر موسیٰ بھائی کو تمہاری ضمانت کے لیے تھانے بھیجا تھا۔“

میرے اندر ایک دھماکہ سا ہوا۔ گو یا اب تک جانے انجانے میں خود بھی ناہید کے ٹیوٹر کے روپ میں سارنگا کی ہی نوکری کر رہا تھا۔

میرے اندر ایک دھماکہ سا ہوا۔ گویا پتک جانے انجانے میں خود بھی تباہی کے ٹیوٹر کے روپ میں سارنگا کی جی نوکری کر رہا تھا۔



## میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے ”حال“ سے غیر مطمئن ہونے اور ”شکر“ کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار نئب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔ یہ ناول کتب گھر بردستاپ ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں بڑھا جا سکتا ہے۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



## باب 11

میں ابھی تک ہکا بکا سا تھا۔ ”مگر..... تم..... تم نے تو کہا تھا کہ تم کسی سینٹھ داؤد کے ملازم ہو؟ اور یہ کہ تمہارا مالک دوہی گیا ہوا ہے۔“

اسماعیل نے ایک گہری سی سانس لی..... یہ ایک لمبی کہانی ہے، کبھی وقت اور موقع ہوا تو سناؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ دنیا والوں کی نظر میں ناہید بٹیا سینٹھ داؤد کی صاحبزادی ہے۔ جسے دنیا سے گزرے دو سال ہو چکے، اسکول اور کالج میں بھی بٹیا کی یہی ولدیت درج ہے لیکن رنگا بھائی کے صرف چند قریبی ساتھی ہی جانتے ہیں کہ ناہید کا اصل باپ خود سارنگا ہے، لیکن اس کی پیدائش والے دن سے ہی اس نے اپنے نام کی بدنامی کو اپنی بٹی کے نام کے ساتھ جوڑنے سے گریز کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تعلیمی میدان یا ذاتی زندگی میں کہیں بھی ناہید اس کے نام سے جانی جائے۔ وہ اس کو بھی میں رہتا بھی نہیں جہاں ناہید بنی رہتی ہے۔ گھر میں میرے علاوہ صرف بوا ہے جسے یہ بات پتہ ہے۔“

میں حیرت سے اسماعیل کی بات سنتا رہا۔ ”لیکن کیا ناہید یہ بات جانتی ہے کہ سارنگا ہی اس کا باپ ہے؟“ اسماعیل نے گاڑی کا کھیر بدلا

”ہاں..... اور وہ اپنے باپ سے بے انتہا محبت کرتی ہے..... شاید سارنگا کی بھی دنیا میں واحد کمزوری اس کی اپنی بٹی ہی ہے.....“

اسماعیل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ سارنگا ہمیشہ ہی سے ”رنگا بھائی“ نہیں تھا۔ تیس (30) سال پہلے وہ صرف یعقوب فورمین تھا جو اپنے بڑے بھائی داؤد کے ساتھ دوہی کے ریگزاروں میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیسہ اپنے ملک میں منتقل کرتا تھا تا کہ ایک دن یہاں وہ اپنے پسینوں کا محل تعمیر کر سکے۔ دونوں بھائیوں نے دن رات اپنا خون پسینہ بہا کر ایک ایک پائی جوڑی لیکن کچھ بازی گروں نے فنانس کمپنی کے نام پر دونوں بھائیوں کا ملک میں جمع شدہ پیسہ ہڑپ کر لیا۔ ان دنوں ملک میں چاروں طرف ایسی کمپنیوں کا ایک مافیا سا قائم ہو چکا تھا اور داؤد اور یعقوب بھی اس کی زد میں آ گئے۔ داؤد کا پیسہ تو ایک ایسی کمپنی کھا گئی جو ملک میں آسانی کتاب کی اشاعت کے سب سے بڑے تاجر تھے۔ آخر کار یعقوب کو حساب کتاب کے لیے ملک واپس آنا پڑا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ یعقوب پر اپنی اور زمین کے کاروبار میں کچھ یوں ابھرا کہ ساحلی شہر کے بڑے بڑے صنعت کار اس کی چوکھٹ پر حاضری دینے لگے۔ کہتے ہیں کہ اس نے زمین کے کاروبار میں باقاعدہ اپنا ایک گروہ بنالیا تھا جو راتوں رات زمین پر قبضہ کرنے میں ذرا دیر نہیں کرتا تھا۔ یعقوب، یعقوب فورمین سے رنگا بھائی کیسے اور کب بنایا تو کوئی نہیں جانتا ہاں مگر دنیا اتنا ضرور جانتی تھی کہ یعقوب فورمین نے سارنگا بننے سے پہلے آخری قبضہ ایک رنگ ساز کارخانے پر کیا تھا۔ کہتے ہیں کارخانے کا مالک بھی بڑا جی دار اور اونچی پہنچ والا بندہ تھا مگر جیت یعقوب کی ہوئی۔ تب سے اس کے نام کے ساتھ کارخانے کا نام سارنگا لگ گیا تھا جو رفتہ رفتہ رنگا بھائی میں تبدیل ہو گیا۔ داؤد جب ملک واپس آیا تو سینٹھ داؤد بن چکا تھا، لیکن اس نے اپنی پہچان کو سارنگا کی بدنامی سے ذرا پرے ہی رکھا، مگر دونوں بھائیوں میں اندرون خانہ زبردست ایک تھا۔ اسی نے رنگا کی شادی ایک سیدھی ساوھی عورت سے کروادی جو انہی دو بھائیوں کی برادری میں سے تھی۔ رنگا کی بیوی نے ایک بیٹے اور اس کے دو سال بعد ایک بیٹی کو جنم دیا اور پھر کسی وبائی مرض میں مبتلا ہو کر چل بسی۔ سارنگا کی زندگی کا محور اب اس کی اولاد تھی لیکن کہتے ہیں کہ بہت زیادہ پیسہ اور زور اپنے ساتھ

بہت سارے دشمن بھی لے کر آتا ہے۔ رنگا کا اسکول جاتا بیٹا بھی اسی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ جب رنگا نے اپنی بیٹی کو داؤد کے حوالے کر دیا اور خود اپنی دشمنیاں نبھانے لگا۔

بھائی کی موت کے بعد سارنگا نے شہر بدل لیا اور ہمارے شہر میں آ کر اپنی بیٹی کے لیے وہ حویلی خرید لی۔ آس پاس اپنے وفاداروں کا فولادی جال بن کر وہ بھی ہر وقت اپنی لاڈلی کے لیے ہر وقت پریشان ہی رہتا ہے۔ زندگی نے سارنگا کو ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا کہ سب کچھ پاس ہوتے ہوئے بھی وہ علی الاعلان اپنی بیٹی کو بیٹی نہیں پکار سکتا تھا۔“

اسامیل کی باتوں میں راستہ کیسے کٹ گیا مجھے کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ میں تب چونکا جب گاڑی پورچ میں داخل ہو کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں بڑے ہال میں پہنچا تو بوا اور ناہید دونوں کو ہی پریشان پایا۔ ناہید مجھے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکی ”آیان بھائی..... آپ ٹھیک تو ہیں ناں..... پولیس نے آپ کو زیادہ جگ تو نہیں کیا..... جب اسامیل چاچا نے آپ کی گرفتاری کی خبر دی تھی، میں اور بوا تو پریشانی کے مارے ایک کروٹ بھی چین سے نہیں بیٹھے۔“

میں اس معصوم سی مخلص لڑکی کو دیکھتا رہا۔ کیا دنیا سے خلوص اور وفا بالکل مٹ چکے ہیں؟ نہیں..... کیونکہ میرے سامنے ان کہے رشتوں کا خلوص اب بھی بکھرا پڑا تھا۔ میں نے ماحول کو بد لے کی خاطر خوش دلی سے کہا ”میں سمجھتا تھا کہ صرف میری امی ہی ملکہ جذبات ہیں، لیکن آج پتہ چلا کہ اس گھر میں تو ان کی نکر کے لیے دو، دو ملکائیں موجود ہیں.....“ بوا اور ناہید دونوں ہی میری بات سن کر مسکرا دیں ”وہ تو بڑی خوش ہوتی ہیں جب میں انہیں یہ لقب دیتا ہوں“ ناہید کی آنکھوں میں ایک عجیب سی حسرت در آئی۔ ”آیان بھائی سچ..... کبھی کبھی بہت جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے سب گھروالوں سے ملوں..... امی سے، رافعہ سے، ریحان بھائی سے..... آپ مجھے لے چلیں گے نا اپنے گھر..... لیکن بابا تو مجھے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتے..... آیان بھائی..... میں بھی باقی سب کی طرح رہنا چاہتی ہوں..... آزاد..... اپنی مرضی کی مالک.....“

”تم فکر نہ کرو..... میں تم اور بوا تمہارے بابا سے چھپ کر سب سے مل آئیں گے..... چلو اب یہ اداسی پر ریختم کرو۔“ ناہید بچوں کی طرح خوش ہو گئی ”سچ.....؟ ہاں یہ ٹھیک ہے..... ہم چھپ کر سب سے مل آئیں گے.....“ پھر جیسے ناہید کو اچانک کچھ خیال سا آیا۔ ”آیان بھائی..... بابا میری حفاظت کی خاطر مجھ سے دور رہتے ہیں۔ لوگ ان کے خوف کی وجہ سے میرے قریب نہیں آتے..... کالج میں بھی میری کوئی سہیلی نہیں ہے، حالانکہ میں وہاں سینئر داؤد کی بیٹی کی حیثیت سے داخل ہوں..... لیکن جنہیں یہ پتہ ہے کہ میرا سارنگا فیملی سے کوئی تعلق ہے وہ میرے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں..... حتیٰ کہ کوئی مجھے ٹیوشن پڑھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ آپ نے ہامی بھر لی۔ آپ مجھے پہلے دن سے ہی بالکل اپنے بھیا کی طرح لگے۔ کھوئے کھوئے سے..... لا پرواہ سے..... سلمان بھیا بھی بالکل ایسے ہی تھے۔ اسی لیے میں نے اسامیل چاچا کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ آپ سے کچھ نہ چھپائیں۔ چاچا کو خوف تھا کہ بابا اس بات سے کہیں ناراض نہ ہو جائیں لیکن میں نے بابا سے بھی کل رات صاف کہہ دیا تھا کہ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی، اور بابا میری بات کبھی ٹال نہیں سکتے اس کا مجھے ہمیشہ سے یقین ہے.....“

ناہید بے خودی کے عالم میں اپنے بابا کی باتیں بتاتی گئی اور میں سوچتا رہا کہ باہر کی دنیا میں اس بات پر کون یقین کرے گا کہ سارنگا کے دل

میں بھی ایک باپ کا دل ہو سکتا ہے۔ انسان اپنے اوپر کتنی تمیزیں کتنی پر تمیز چڑھائے رکھتا ہے۔ اس کی خبر کسی کو نہیں ہو سکتی۔ کبھی کبھی تو ہمارے اندر کا انسان اس تہہ در تہہ پر ت در پر ت خول کے نیچے ہمیشہ کے لیے کھوجاتا ہے، اور ہم صرف ایک مصنوعی چہرے کے ساتھ ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ اس روز میں معمول سے کچھ زیادہ دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ پڑھائی کا تو موقع ہی نہیں ملا۔ بس ناہید کی سنتا رہا۔ شاید اس کے دل پر پڑا بہت دنوں کا بوجھ اتر گیا تھا اس لیے وہ ہلکی پھلکی ہو کر اپنے بچپن سے لے کر اب تک کی ہر بات مجھ سے بانٹ رہی تھی۔ جانے یہ لڑکیاں اتنی چھوٹی چھوٹی سی باتیں اپنی تمام جزئیات کے ساتھ کیسے یاد رکھ لیتی ہیں۔ میں نے اس موقع پر ابا کی طرف سے اپنے ”دلیس نکالے“ کا اجرا کرنا سے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

نتیجہ جب میں باہر نکلا تو ناہید کی باتوں کی پٹاری بند ہوتے ہوئے گہری شام نے اپنے بال کھول دیے تھے۔ اسماعیل میرے انتظار میں پورچ میں ہی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا ”بابو..... میں جانتا تھا کہ آج تمہیں دیر ہو جائے گی۔“ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ”پہلے تو مجھے تم یہ بتاؤ کہ تم مجھے بابو کیوں کہتے ہو؟ آیا کہ کہہ کر کیوں نہیں بلاتے؟“ اسماعیل نے گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر سڑک پر ڈال دی ”بس مجھے اچھا لگتا ہے۔ تم کپڑے بھی تو بابوؤں جیسے پہنتے ہو.....؟“ میں نے اپنی پرانی جینز اور آدھی آستین کی چیک والی شرٹ پر نظر ڈالی اور مجھے ہنسی آگئی۔

”لیکن میرے ابا کے بقول یہ لوفروں والا لباس ہے.....“ اسماعیل بھی ہنس پڑا۔ ”آج کہاں اتاروں تمہیں.....؟ گھر تو تم جانیس سکتے.....“

”کہیں بھی اتار دو..... جو بے گھر ہوتے ہیں۔ سارا شہر انہی کا ہوتا ہے..... کسی بھی فٹ پاتھ پر یا پارک میں رات گزاری جا سکتی ہے.....“ اسماعیل کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

”بابو ایک بات مانو گے میری.....؟“

”ضرور..... اگر میرے اختیار میں ہو تو ضرور.....“

”تم میرے ساتھ چلو..... میں رنگا بھائی کی حویلی کے پچھواڑے کو اترز میں رہتا ہوں۔ میرا اس دنیا میں کوئی خون کا رشتہ باقی نہیں رہا..... جب تک تمہارے ابا تمہیں معاف نہیں کر دیتے یا تمہیں کوئی دوسرا مستقل ٹھکانہ نہیں مل جاتا تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ وہ جگہ بدنام ضرور ہے لیکن یقین کرو وہاں اتنے بے لوگ نہیں رہتے جتنے ان اجلی اور نئی کوٹھیوں میں رہائش پذیر ہیں۔ اگر مجھ پر ذرا بھی اعتبار ہے تمہیں تو یقین رکھو کہ اسماعیل تمہیں کبھی کسی غلط جگہ چلنے کے لیے نہیں کہے گا.....“ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ”مجھے اپنے علاوہ دنیا کے باقی ہر شخص پر اعتبار ہے۔ جانے میں خود پر کب اعتبار کرنا سیکھوں گا۔“ میری بات سن کر اسماعیل نے پہلے یونٹن ہی سے بنا کسی جھٹ کے گاڑی موڑ لی۔ فضا میں ٹائروں کی چرچر اہٹ دور تک گونجی۔ کچھ ہی دیر میں شہر کا وہ علاقہ شروع ہو گیا جو انگریز کے دور میں اصل شہر تھا اور اب اندرون شہر یا صدر کا علاقہ کہلاتا تھا۔ یہاں پرانے طرز کے مکانات اور چھوٹی بڑی حویلیوں کی بہتات تھی۔ یہ متوسط درجے کے لوگوں کا یا پھر اب تک اپنی پرانی تہذیب سے جڑے متول لوگوں کا رہائشی علاقہ تھا۔ پرانے طرز کے مکان، چوبارے، گلیاں اور کھڑکیوں سے جھانکنی ماضی کی شاندار روایت کی عکاسی کرتی بالکونیاں اب بھی ویسے ہی ایستادہ تھیں۔ میرے ذہن میں ایک عجیب سی بات آئی کہ انسان شاید ازل سے اب تک زوال کا ہی شکار رہا ہے۔ اسی لیے ہمیں ہر حال کے دور میں ماضی کی روایات، تعمیرات اور سلیقے سدا بھاتے ہیں۔ سوچن پر ماضی پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے وہ ماضی پر بہت کچھ ایسے قصور وار بھی نہیں کیونکہ حال اور مستقبل کا



آئینہ ماضی کے مقابلے میں ہر دور میں دھندلائی رہا ہے۔

گاڑی تنگ سڑکوں اور کشادہ گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک ایسے احاطے میں داخل ہو گئی جس کے چار اطراف پھولوں کے خوانچوں سمیت خشک میوے، دودھ اور پنسار کی دوکانیں موجود تھیں۔ مغرب کا وقت تھا اور بازار میں کافی چہل پہل تھی۔ انہی دوکانوں میں شاید کہیں پرانے ریکارڈوں کی دوکان میں کوئی پرانا گیت بج رہا تھا۔ ”دو ہنسوں کا جوڑا..... پچھڑ گیورے..... گجبھیو راما..... ظلمھیو رے.....“ میں بھی تو ایک پچھڑا ہوا ہنس تھا۔ جوانی ڈار سے علیحدہ ہو جانے کے بعد اب یہاں وہاں بھٹک رہا تھا۔ ایک لمحے کے اندر ہی مجھے کیسے فراق، اپنے گھر اور دوستوں کی بے حد اور بری طرح یاد آنے لگی۔

گاڑی ایک بہت بڑے سے چوبی گیٹ کے سامنے جا کر رک گئی اور اسماعیل نے تین بار کچھ مخصوص انداز میں ہارن بجایا۔ گیٹ کے اندر سے کسی نے چھوٹی سی روشن دان نما کھڑکی کا تختہ ہٹا کر باہر چھانکا اور پھر فوراً ہی دوسری بدن کے دربانوں نے گیٹ کھول دیا۔ گیٹ پر یعقوب مینشن کی تختی لگی ہوئی تھی۔ گویا سارنگانے اپنے پرانے نام سے مکمل ناٹ نہیں توڑا تھا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی تو مجھے ایک اور ہی جہاں دیکھنے کو ملا۔ یہ جوہلی بذات خود کسی محلے جتنی ہی وسیع و عریض تھی جس کے بڑے بڑے دالان اور اونچے اونچے سفید ستون کسی پرانی رومن دور کی فلم کے منظر کی یاد دلا رہے تھے۔ دالانوں میں جا بجا لکڑی یا سنگ مرمر کے تخت بچھے ہوئے تھے جن پر کچھ ضعیف مگر پہلوان نما افراد بیٹھے اپنے سامنے ہوتے دنگل کے کھلاڑیوں کی رہنمائی کر رہے تھے اور انہیں مختلف داؤ بیچ سکھا رہے تھے۔ ایک طرف باقاعدہ چاقو کھولنے بند کرنے اور اسے کھائی میں گھمانے یا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کی مشق ہو رہی تھی۔ مجھے ایک دم ہی شوکی کا چاقو یاد آ گیا۔ ایک جانب خالص دودھ کی باقاعدہ سبیل سی لگی ہوئی تھی اور اہتمام دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں روزانہ منوں کے حساب سے خالص دودھ آتا ہوگا۔ تو گویا باہر کی دوکانوں میں دودھ کے کاروبار کی وجہ بھی یہی احاطہ ہی تھا۔ احاطے میں موجود بڑے بڑے دالانوں کو کیاری کی اینٹوں سے مختلف مگر ایک ہی پینش کے درجنوں ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس میں ریت اور خشک یا گیلی مٹی سے پاٹ کر کے انہیں مشق کے قابل بنایا گیا تھا۔ مجھے تو وہ جوہلی کم اور پہلوانی سکھانے کا کوئی اڈہ زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ چاروں طرف استادوں اور شاگردوں کے شور سے ایک عجیب سا سماں بندھ گیا تھا۔

میں نے حیرت سے اسماعیل کی طرف دیکھا ”یہ سب کیا ہے.....؟“ اسماعیل مسکرایا ”اپنے رنگا بھائی کو ہمیشہ سے بس ایک شوق ہی تو رہا ہے..... کسرت کا۔ داؤ بیچ کا اور کھائی کے زور کا..... اور تم یہ جتنے نوجوان یہاں تربیت لیتے ہوئے دیکھ رہے ہو۔ آگے چل کر یہ رنگا بھائی کے علاقوں کا کنٹرول بھی سنبھالیں گے۔ جو اس وقت کام سنبھال رہے ہیں۔ وہ بھی سال دو سال پہلے یہیں سے سیکھ کر میدان میں نکلے ہیں..... یہ رنگا بھائی کی فوج ہے بابو.....“

”لیکن اس دور میں لڑنے والا کھائی کا زور اور داؤ بیچ استعمال ہی کب کرتا ہے۔ وہ تو پٹیل یا کلاشن کوف نکالتا ہے اور پل بھر میں کھیل ختم..... بلکہ اب تو پٹیل اور یو اور جتنے ماؤز بھی آگئے ہیں..... پھر ان آتشیں اسلحہ برداروں کے سامنے تمہاری یہ فوج کس کام کی.....“

اسماعیل نے برا سامنہ بنایا ”گولی سے بزدل لڑتے ہیں۔ ہمارے دھندے میں اصل کی پہچان زور ہے اور یہی پیمانہ بھی ہے..... ہاں جن تھڑ دلوں اور پٹیل چلانے والے کم ظرفوں کی تم بات کر رہے ہو ان کے بندوبست کے لیے بھی یہاں خاص انتظام موجود ہے، لیکن وہ صرف محافظ

ہوتے ہیں۔ اڈے کا اصل آدمی کبھی ایسی اوجھی حرکت نہیں کرتا، لیکن ایسے اوجھے وار کرنے والوں کو جواب دینے کے لیے اس کے ساتھ یہ آتشیں اسلحہ رکھنے والے محافظ بھی ہمیشہ موجود رہتے ہیں.....“

میں حیرت سے اسماعیل کی باتیں سنتا رہا۔ میرے لیے یہ بالکل نئی دنیا تھی جہاں باقاعدہ شاگردی کی رسم ہوتی تھی اور چاقو بازی یا زور سیکھنے کے لیے شاگرد کی کلائی پر دھاگانا باندھا جاتا تھا اور بدلے میں وہ اپنے استاد کو ٹیگ میں جوڑا، گچڑی، ایک سوا یک روپیہ اور امام ضامن پیش کرتا تھا۔ چاقو بازی کی شاگردی کے لیے پہلے اپنا چاقو استاد کے قدموں میں ڈالا جاتا تھا اور پھر جب استاد وہ بند چاقو اٹھا کر اور کھول کر اپنے شاگرد کے حوالے کرتا تو باقاعدہ اسے شاگرد کی سند مل جاتی تھی۔

بعض مشقوں کی شاگردی پانے کے لیے وفاداری کے طور پر شاگرد کو اپنی کلائی کاٹ کر خون کے چند قطرے استاد کے قدموں یا پھر اڈے کی مٹی کے نذر کرنے ہوتے تھے۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب وہ عمر بھر اپنے استاد اور اس اڈے سے وفاداری نبھائے گا۔

عام اسکول کالجوں کی طرح یہاں بھی وقت اور سندرہاں تھی۔ جو جتنا مشق میں وقت گزارتا اور مختلف امتحان پاس کرتا جاتا اس کا درجہ اور سند بھی اس قدر بلند ہوتی جاتی۔ جیسے کرائے میں مختلف بیلٹس Belts کی ڈگری ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی جماعت اور مشق کی بنیاد پر شاگردوں کو مختلف درجوں میں بانٹا جاتا تھا۔ شاید سارنگا کی یہی فوج تھی جو تربیت پانے کے بعد شہر میں اس کا راج چلاتی تھی۔ زمین پر قبضہ کرتی تھی اور سارنگا کی ان دیکھی حکومت کے احکامات کو شہر بھر میں رائج کرتی تھی۔

اسماعیل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ زیر زمین حکومت بھی باقاعدہ ایک طریقہ کار کے تحت وجود میں آتی تھی اور شاید ہماری ظاہری حکومت سے کہیں زیادہ شفاف اور ایماندارانہ چناؤ اس حکومت کے قیام کے لیے رائج تھا۔ شہر کے تمام چھوٹے بڑے زیر زمین گروہ اس چناؤ میں شامل ہوتے تھے اور چار یا دو بڑوں کو اپنا رہنما تسلیم کر کے ان کا چناؤ کرتے تھے۔ چناؤ کے لیے باقاعدہ کوئی دن مخصوص ہوتا تھا اور پرچی اور بولی کے ذریعے اپنے رہنما چن لیے جاتے تھے۔ وہ چار رہنما شہر کے نقشے کو میز پر رکھ کر اسے چاقو کے ذریعے چار حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور یوں مشرق، مغرب اور شمال جنوب کے چار علاقے وجود میں آ جاتے تھے۔ پھر ان علاقوں کی حکمرانی کے لیے یا تو میسے کی بولی اور یا پھر زور اور بل کی بنیاد پر حصہ داری تقسیم کر لی جاتی تھی۔ عام طور پر بندرگاہ، ریلوے اسٹیشن اور ڈاک یارڈ وغیرہ کے علاقے جس کے حصے میں آتے وہ زیادہ خوش قسمت تسلیم کیا جاتا تھا، مگر ایک بار جب تقسیم ہو جاتی تو اگلے تین سال تک ان میں سے کوئی بھی لیڈر دوسرے کے علاقے میں دخل اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کرنے کی صورت میں زیر زمین دنیا کے بزرگ اور پرانے حکمران سخت جرمانہ عائد کرتے تھے اور بعض اوقات ایسی جرأت کی پاداش میں درانداز کو علاقہ بدری اور نااہلی کی سزا بھی مل سکتی تھی۔ ہاں اگر کوئی زور کے بل پر کسی کے علاقے کا دعوے دار ہوتا تو اسے باقاعدہ مقابلہ کر کے اپنی طاقت ثابت کرنے کے بعد وہ علاقہ چھیننا پڑتا تھا مگر اس مقابلے کے اصول بھی بزرگ رہنمای طے کرتے تھے اور ان کی سینٹ Senate ہی آخری فیصلہ صادر کرتی تھی۔

میں یہ سب سن کر ایک جہان حیرت میں غرق تھا کہ اچانک میرے عقب سے آواز ابھری اور کسی نے میرے کاندھے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی ”باہر سے کیا تماشا دیکھ رہے ہو۔ ہمت ہے تو اکھاڑے میں آکر مقابلہ کرو.....“ میں نے پلٹ کر دیکھا۔



## باب 12

میرے پیچھے موسیٰ اور سارنگا کھڑے تھے۔ سارنگا نے قریب آ کر گرم جوشی سے مجھے سینے سے لگا لیا۔ موسیٰ نے بھی حسب عادت میرے سینے اور بازوؤں کی ہڈیاں چٹخاں ڈالیں ”اچھا کیا تو یہیں آ گیا۔ ہم برے ہیں..... پر اتنے بھی برے نہیں ساجن.....“

اسماعیل نے دبی دبی آواز میں سارنگا کو بتایا کہ وہ مجھے کس شرط پر اپنے ساتھ یہاں لے کر آیا ہے اور یہ کہ میں اس کے ساتھ ہی بچھلے حصے میں ٹھہروں گا۔ موسیٰ نے اسماعیل کو ڈانٹا ”کیوں بے..... تو کہاں کا حاجی ہے کہ شہر کی رہ نمائی کرنے چلا ہے.....؟“ سارنگا مسکرایا ”چل ٹھیک ہے..... جیسے تیری مرضی..... ہمارے حصے میں رہ یا بچھلے حصے میں..... رہے گا تو اپنے ساتھ ہی..... اپنی لاڈلی حیرتی بڑی تعریف کرتی ہے، کہتی ہے بھیا بنالیا ہے میں نے اسے..... تو اس ناٹے سے تو تو ہمارا بھی کچھ ہوانا..... کسی چیز کی ضرورت ہو تو مانگ لینا..... شرم نہ کرنا..... پھر چلیں گے کسی دن تیرے باوا کی طرف بھی..... انہیں منانے.....“

سارنگا نے جاتے جاتے اسماعیل کو ہدایت کی کہ وہ میرے لیے حویلی کے عقب میں بنے مہمان خانوں کے کمروں میں سے کوئی بھی کمرہ کھلوادے اور میرے کھانے پینے سمیت ہر چیز کا خیال رکھے۔ پھر دو قدم چل کر وہ واپس پلٹ آیا۔

”اور سن اسماعیل..... دو چار جوڑی کپڑے بھی بنوادے اس ضدی کے لیے..... درزی کو یہیں بلو الینا اور بتا دینا کہ صبح کپڑے تیار چاہئیں..... کیا سمجھا.....؟“ اسماعیل نے جلدی سے تابعداری میں سر ہلایا۔ سارنگا موسیٰ کے ساتھ نہ جانے کس گوشے کی جانب چلتا ہوا غائب ہو گیا۔ ویسے بھی اس طویل و عریض حویلی کی بھول بھلیوں کو یاد رکھنے میں مجھے ہفتوں لگ سکتے ہیں۔ اسماعیل مجھے لیے حویلی کے عقب میں رہائشی حصے میں آ گیا۔ اس طرف شاید عام لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ یہ بھی پرانے طرز کی ایک پوری حویلی ہی تھی۔ تقسیم ہند سے قبل اس علاقے میں ہندوؤں کے بڑے بڑے پاڑے اور مندر تھے۔ لہذا یہاں کی تعمیر میں ہندو ثقافت کا رنگ بھی نمایاں نظر آ رہا تھا۔ کمروں کے سامنے کشادہ اور وسیع برآمدہ جس کے فرش پر قدیم طرز کی منقش مینا کاری کی گئی تھی اور برآمدے کے سامنے سرخ اینٹوں کا بہت بڑا دالان۔ دالان کے درمیان میں بہت بڑا سا بیڑ جس کے گرد سفید سنگ مرمر کا بڑا سا گول چوترا بنا ہوا تھا۔ دائیں جانب چند سنگ مرمر کی مورتیاں اور ان سے پرے ایک بہت بڑا سا باغیچہ تھا جہاں رنگ برنگ پھول اور درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

باغیچے کی گھاس اور باڑھ بہت نفاست اور ترتیب سے تراشی ہوئی تھی۔ آس پاس بہت سے نوکر اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ اسماعیل کو دیکھ کر سبھی نے اسے تعظیم دی۔ مطلب اسماعیل کو یہاں رنگا کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسماعیل کے اشارے پر میرے لیے فوراً ایک کمرہ کھول دیا گیا۔ کمرہ کیا تھا پورا ہال تھا۔ ہمارے کوارٹر کے تینوں کمرے اس میں سما جاتے۔ پرانے طرز کی بڑی بڑی لکڑی کی کھڑکیاں اور ڈوری سے کھلنے اور بند ہونے والے چاروں دیواروں میں روشن دان..... کمرے کے وسط میں وسیع چوبی پینگ اور دائیں جانب قد آدم آئینہ (ڈریسنگ) اسماعیل نے



کمرے میں گھوم پھر کر غسل خانے اور باقی الماریوں وغیرہ کا جائزہ لیا۔ ”کمرہ ٹھیک ہے نا۔۔۔ پسند نہ ہو تو بدلوا لینا۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن مجھے اتنے بڑے کمرے میں سونے کی عادت نہیں ہے۔۔۔ تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔“ اسماعیل ہنس پڑا ”وہ بابو۔۔۔ کھلی برسات میں سڑک کنارے بچے لکڑی کے تختے پر تو خوب مزے سے سو جاتے ہو اور کمرے میں ڈرتے ہو۔۔۔“ میں خاموش رہا۔۔۔ اب اسے کیا بتانا کہ وہ سڑک کے کنارے نصب لکڑی کا بیچ تو بچپن سے مجھے ماں کی طرح لوری دے کر سلاتا رہا ہے اس کا مقابلہ بھلا ان بے جان مخلوق کی خواب گاہوں سے کیا؟

کچھ ہی دیر میں رات کا کھانا آ گیا۔ پوری دعوت کا اہتمام تھا۔ اسماعیل نے مجھے بتایا کہ حویلی کا اپنا لنگر خانہ ہے جو چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے۔ اس نے مجھ سے ناشتے کے بارے میں پوچھا ”صبح کے لیے کوئی خاص فرمائش ہے تو بتاؤ۔۔۔ کیا ناشتہ کرو گے۔۔۔؟“

”ایک سادہ روٹی اور چائے کا ایک پیالہ۔۔۔“ اسماعیل کا منہ کھلا رہ گیا ”بس۔۔۔ اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔“

”نہیں۔ ہم برسوں سے گھر میں ایسا ہی ناشتہ کرنے کے عادی ہیں۔“ مجھے یاد آیا کہ امی کس طرح ریحان اور چھوٹی سے چھپا کر میرے لیے باورچی خانے میں بالائی کا پیالہ اوپر طاق میں رکھ دیتی تھیں اور وہ دونوں پھر شام تک امی سے جھگڑتے رہتے کہ وہ میری وجہ سے ان کے حصے کی چیز بھی مجھے کھلا دیتی ہیں۔ میری آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے لیکن میں نے آنکھیں مسل ڈالیں۔ اسماعیل کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد واقعی مجھے تنہائی کا احساس کاٹنے لگا۔ میں نے بستر پر آدھا گھنٹہ کروٹیں بدلنے کے بعد تنگ آ کر سبھی کھڑکیوں کے پردے ہٹا ڈالے۔ باہر آسمان پر میرے بچپن کے سبھی دوست تارے حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے کیونکہ آج تک میں ان سے اپنی چھت سے باتیں کرتا آیا تھا، لیکن آج وہ سب مجھے اس اجنبی جگہ دیکھ کر حیرت سے اپنی آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے۔ پھر مجھے اس ماہ رو، مہتاب کا خیال آ گیا۔ کیا وہ بھی اپنے گھر کے آگن سے ان تاروں کو دیکھ رہی ہوگی؟ کیا وہ بھی مجھے سوچتی ہوگی۔۔۔؟ کیا میرا نام اتنا مقدر والا ہوگا جسے وہ اپنی تھیلی پر لکھ لکھ کر مٹاتی ہوگی۔۔۔؟ نہیں نہیں۔۔۔ مجھ جیسے آوارہ بخارے کے لیے کوئی نازنین بھلا کیوں اپنی زلف کو پریشان کرے گی۔۔۔ مگر اس نے خود ہی تو کہا تھا کہ اسے میری بہت فکر ہے۔۔۔ پوری رات میرا نادان دل خود ہی اعتراض پیدا کرتا رہا اور خود ہی تاویلیں گھڑ کر ان اعتراضات کے جواب بھی دیتا رہا۔ سچ ہے کہ دل کسی کا دوست نہیں۔ یہ خود عشق کی بھی سلاگ تا ہے اور پھر خود ہی ہماری نسوں میں بہتے خون کو اس بھی کا ایندھن بنا کر آخری قطرے تک جلاتا رہتا ہے۔

میں بھی صبح تک اسی عشق بھی میں جلتا رہا لیکن اس سوال کا جواب پھر بھی نہ مل سکا کہ کیا گہنا بھی میرے بارے میں سوچتی ہوگی؟ صبح ناشتے کے ساتھ ہی اسماعیل بھی پہنچ گیا ”کیوں بابو۔۔۔ نیند تو آئی نا ٹھیک ہے؟“ اسماعیل کے ہاتھ میں کپڑوں کا تھیلہ تھا ”چلو نہا دھو کر کپڑے بدل لو۔۔۔ یہ تمہارا نیا لباس ہے۔۔۔“ اسماعیل نے تھیلے سے کرنا شلوار نکال کر ڈنگر میں لٹکا دیا۔ میں نے مسکرا کر اسماعیل کو دیکھا ”ایک تعویذ اور ہاتھ کا کڑا بھی لا دو۔۔۔ پورا ڈے والا بن کر پھروں گا۔۔۔“ ناشتے کے دوران اسماعیل نے مجھے بتایا کہ روزانہ صبح 10 بجے سارنگا کا دفتر لگتا ہے جہاں دن بھر کی مصروفیات اور آئندہ کے کام بانٹے جاتے ہیں۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا ”دفتر۔۔۔؟ کیا۔۔۔ یہاں بھی باقاعدہ دفتری کام ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

”دفتر کیا آیان بابو..... پوری عدالت کہو..... حکومت چلانا آسان کام تھوڑی ہے.....“

یہاں میرے لیے ہر قدم پر ایک نئی حیرت بائیں کھولے میری منتظر کھڑی تھی۔ اسماعیل کے بقول یہ علاقہ ابھی چند ماہ پہلے ہی سارنگا کے قبضے میں آیا ہے۔ اس سے پہلے کوئی ”کالی“ نام کا زور آور اس علاقے کا مالک تھا لیکن رنگا اسے ہرا کر شہر کے اس حصے کا قبضہ دار بنا جس میں ہمارا کیفے فراق اور بابو کالونی بھی شامل تھی۔ علاقے کا کنٹرول سنبھالتے ہی قبضہ دار کو سب سے پہلے مختلف حصوں کی تعیناتیاں (پوسٹنگ) کرنی ہوتی ہیں۔ اپنی انتظامیہ کے اہل اور ایمان دار کارندوں کو ان کی اہلیت کے مطابق علاقے بانٹے جاتے ہیں جہاں کے تمام معاملات کے وہی نگران ہوتے تھے۔ ان معاملات میں زمین پر قبضہ، علاقے کے سٹھوں سے بہت وصولی، منافعوں کا اغواء، بازار کا قبضہ، سٹ، جوئے کے اڈوں کا حساب، تاجروں کے معاملات اور شیر بازار کا حساب کتاب، علاقے کے تھانے سے تعلقات و روابط، اپنے علاقے میں کسی دوسرے گروہ کی دخل اندازی کو روکنا اور ایسے کئی دوسرے جھگڑے نمٹانا بھی شامل تھا۔ عام نظام حکومت کی طرح اس زیر زمین سلطنت کی بھی اپنی عدالتیں اور اپنی سزائیں مقرر تھیں، اور شاید ہماری ظاہری حکومت سے کہیں زیادہ پر اثر اور مکمل بھی۔ حکومتی اہل کاروں کی طرح یہاں بھی عہدے دار اپنے عہدے کے حساب سے اپنا کام سر انجام دیتے تھے۔ مجھے یہ سن کر بھی بہت حیرت ہوئی کہ ہر علاقے میں ایسے لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہوتی ہے جو ہماری سرکار اور عدالتوں کے چکر میں پڑنے کے بجائے براہ راست اپنے جھگڑے اسی زیر زمین نظام کے تحت حل اور ختم کروانے پر یقین رکھتے ہیں اور وہ اس نظام کے فیصلوں کو من و عن تسلیم بھی کرتے ہیں، کیونکہ یہاں انصاف ملنے میں دیر نہیں لگتی۔ عام عدالتوں کی طرح سالوں بچل خوار نہیں ہونا پڑتا نہ ہی ہر روز پولیس اور عدالتوں کے ہاتھ اپنی عزت نفس کو کھپتے ہوئے دیکھنا پڑتا ہے۔ مجھے اس روز اپنے ایک اور سوال کا جواب بھی مل گیا۔ جس دن سے میں نے سارنگا کی اس بادشاہت کے بارے میں سنا تھا میرے ذہن میں ایک الجھن ہمیشہ کلبلائی رہی کہ اگر ایسا کوئی زیر زمین نظام ہمیشہ سے ہمارے آس پاس موجود رہتا ہے تو پھر مجھ جیسے عام انسانوں کو اس کے بارے میں پتہ کیوں نہیں چلتا؟..... اسماعیل کی باتیں سن کر یہ معہ بھی حل ہو گیا۔ اس نظام کا براہ راست تعلق زراور زور والوں کے ساتھ تھا۔ غریب بے چارہ تو ان کے لیے صرف مزدوری ہی کر سکتا تھا۔ اس نظام کا غربت اور غریب سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے مجھ جیسے غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ نظام سدا پوشیدہ رہتا تھا۔ تاوقتیکہ کوئی حادثہ ہمیں اس زیر زمین دنیا سے متعارف نہ کروا دے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے میں ان جانے میں اس نظام سے آکر آیا تھا۔

جب تک میں اسماعیل کے ساتھ بیرونی احاطے میں پہنچا۔ جب تک رنگا کی عدالت لگ چکی تھی۔ احاطے میں باقاعدہ دربار کی طرح دائیں بائیں دو قطاروں میں بہت سی کرسیاں بچھائی گئی تھیں جن پر عہدیدار اور ضرورت مند آکر بیٹھ چکے تھے۔ سارنگا قطاروں کے اختتام پر درمیان میں رکھے ایک بہت بڑے صوفے پر برہمان تھا اس کے بائیں جانب ہاتھ میں ایک رجسٹر پکڑے کوئی شخص کھڑا لوگوں کے نام پکار رہا تھا اور بائیں جانب موسیٰ کھڑا تھا جو آنے والے مسائل کے کوائف اور مسئلے سے رنگا کو آگاہ کرتا جا رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر موسیٰ نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا..... ”واہ شہزادے..... آج تو اپنا ہی بھائی بند لگ رہا ہے.....“ سارنگا نے چونک کر سر اٹھایا اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ اسماعیل کچھ دور ہی رک گیا تھا لیکن رنگا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلا کر ایک خالی کرسی پر

بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسماعیل وہیں اپنی جگہ کھڑا رہا۔

مقامات کھل چکے تھے۔ سب سے پہلے موٹی توند والا ایک ٹھیکے دار نما سینٹھ اٹھ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ موئی نے تعارف کروایا۔ ”رنگا بھائی یہ اپنا سینٹھ جبار ہے۔ تین سال ہو گئے ہیں اس کے کمرشل پلازے کے کیس کو۔۔۔ دوسری پارٹی قبضہ نہیں دے رہی۔۔۔ کروڑوں کا نقصان ہو چکا ہے اس کا۔۔۔ زمین تو گئی سو گئی۔۔۔ تعمیر کا پیسہ بھی گیا۔ چالیس منزلیں تیار پڑی ہیں لفٹ تک لگ گئی ہے۔“

سارنگا نے لمبی سانس لی۔۔۔ ”ہونہ۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ قبضہ تو اسے تیس 30 دن کے اندر مل جائے گا۔۔۔ مگر ٹھکی پہلی دو منزلیں ہماری ہوں گی۔ منظور ہے تو کاغذ بھروالے اس سے۔۔۔“

سینٹھ جبار کے منہ سے مری مری سی آواز نکلی۔ ”رنگا بھائی گراؤنڈ فلور اور میز ٹائن تو بہت زیادہ ہو جائے گا۔۔۔ میں نیچے کی چالیس دوکانوں کی زبان علاقے کے ایم پی اے کو دے آیا ہوں۔۔۔“ رنگا کو غصہ آ گیا۔ ”زبان دے آیا ہے تو پھر یہاں کیا لینے آیا ہے۔ قبضہ بھی جا کر اسی وزیر سے لے لے۔“ سینٹھ جبار نے بات بگڑتی دیکھ کر جلدی سے دائیں جانب کھڑے منشی نما شخص سے ایک اسٹامپ پیپر لے کر دستخط کر دیے اور سلام کر کے پلٹ گیا۔

دوسرا سائل آگے بڑھا۔۔۔ موئی نے پہچان کروائی۔ ”یہ فیقا فلم والا ہے بھائی۔۔۔ دو سال پہلے اپنی فلم کا اعلان کر کے ایڈوانس بھی دے چکا ہے۔۔۔ لیکن کوئی نیا ہیرو ہے جو وقت نہیں دے رہا۔ پیسے بھی کھا چکا ہے، لیکن اب شوٹنگ کے لیے مزید پیسے مانگ رہا ہے۔ پروڈیوسر تباہ ہو گیا ہے رنگا بھائی۔۔۔“

سارنگا نے فلم پروڈیوسر پر معنی خیز نظر ڈالی۔ ”کیوں بھئی، فیقے عرف رفیق، بل گئی تجھے فرصت اپنی فلم کی پریوں سے۔۔۔ وہ تیری ہیروئن تو اسٹوڈیو سے زیادہ وقت تیرے اس فلیٹ میں گزارتی ہے۔ پھر کیسے بنے گی تیری فلم۔۔۔؟“۔۔۔ موئی نے لقمہ دیا ”زیادہ تر تو یہ اپنی ہیروئنوں سے شادی رچا لیتا ہے رنگا بھائی۔“ رنگا نے زیر لب کچھ کہا اور پروڈیوسر کو جھاڑا ”خوب جانتا ہوں میں اس کی ان فلمی شادیوں کو۔۔۔ بہر حال۔۔۔ کاغذ بھروالے اس سے کہ فلم مکمل ہونے کے بعد چل پڑی تو آدھا منافع ہمارا۔۔۔ اور پیشگی کے طور پر اس کا وہ فلیٹ کھوالے۔۔۔ اچھا ہے نہ رہے گا فلیٹ نہ چلیں گی اس کی یہ عیاشیاں۔۔۔ جا کر اپنی فلم پر دھیان دے۔“ پروڈیوسر بھی دستخط کر کے آگے بڑھ گیا۔ سامنے بیٹھے ایک کچی عمر کے عہدے دار نے شکایت کی ”رنگا بھائی وہ ڈاک یارڈ کا نیا افسر بہت تنگ کر رہا ہے۔ دو مہینے پہلے ہی ڈی ایس پی لگا ہے علاقے میں لیکن آتے ہی ہمارے ہر کام میں دخل دینے لگا ہے۔ دوسرے سندیہ بھی بھجوا رہا ہے کہ ہمارے معاملوں میں ٹانگ نہ اڑائے مگر ایمان داری کا بھوت سوار ہے اس کے سر پر۔“ رنگا نے غور سے عہدے دار کی طرف دیکھا، ایمان دار ہے یا ریٹ زیادہ چاہتا ہے۔۔۔“

”نہیں بھائی۔۔۔ ریٹ تو اس کے آتے ہی دوگت کر چکے ہیں ہم لوگ۔۔۔“ رنگا کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے موئی کو حکم دیا ”وہ کون سا دوزیر ہے جو یہ معاملے دیکھتا ہے۔ ہاں۔۔۔ داخلے کا۔۔۔ فون لگا اس کو۔“۔۔۔ موئی نے جلدی سے دستی فون سیٹ اٹھا کر کوئی نمبر لگا دیا۔ دوسری جانب لائن ملنے پر اس نے فون رنگا کے حوالے کر دیا۔ رنگا نے سلام دعا کے بعد براہ راست شکوہ کیا ”کیا بولوں سرکار۔۔۔ آپ بھی جن جن کر ہمارے



علاقے میں افسر لگاتے ہو۔ ڈاک یارڈ میں جس کو آپ نے نیا بھرتی کر کے بھیجا ہے بار بار راستے میں آرہا ہے۔ کل کلاں کو لڑکے کچھ کر بیٹھیں گے پھر آپ ہی کو شکایت ہوتی ہے کہ پہلے کیوں نہیں بتایا۔۔۔۔۔ وہ دوسری جانب کی بات سننے لگا۔ ”بس اس کو بدلی کرنا ہے اور آج شام تک ہی کرنا ہے۔ ڈاک یارڈ میں آپ کے تیرہ ہزار ووٹ ہیں۔ پبلک ناراض ہوگئی تو اگلے الیکشن میں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ کل تک ہی سہی۔۔۔۔۔ آپ کا ہی دیا کھاتے ہیں۔۔۔۔۔“ رنگا نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا اور عہدے دار سے بولا

”آج تین بجے بڑے دفتر میں جا کر اس افسر کا نام دے دینا جسے ڈاک یارڈ میں لگوانا ہے اور دھیان رہے۔ بندہ کام کا ہو۔۔۔۔۔ ہڈ حرام نہ ہو۔۔۔۔۔“ رنگا دو پہر تک احاطے میں بیٹھا اپنی سرکار چلاتا رہا۔ کون سا مسئلہ تھا جو اس کی عدالت میں پیش نہ کیا گیا ہو۔ چوری، ڈکیتی، قتل، اغواء، قبضہ، رسہ گیری، شادی بیاہ، ہنڈی، سیاسی جھگڑے۔۔۔۔۔ غرض کوئی قضیہ ایسا نہیں تھا جس کا فیصلہ سارنگا نے وہیں بیٹھے بیٹھے نہ کر دیا ہو، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ بمشکل ہی کسی نے اس کے فیصلے پر کوئی اعتراض کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب جانتے تھے کہ چاہے انہیں آدھا انصاف ہی ملے لیکن مل ضرور جائے گا، اور سچ بھی یہی تھا کہ رنگا انہیں فوری طور پر ان کے حصے کا آدھا انصاف فراہم کر دیتا تھا۔ باقی آدھا انصاف رنگا کی سرکار کے حق میں جاتا تھا۔ لہذا کچھ نہ ملنے سے آدھا ملنا ہی سب کے لیے قابل قبول ہوتا تھا۔

دو پہر 2 بجے دربار برخواست ہو گیا۔ باقی ماندہ کیس اگلے دن کے لیے ملتوی کر دیے گئے۔ کچھ ہی دیر میں وہیں درختوں کی چھاؤں تلے ایک وسیع اور کشادہ دسترخوان بچھا دیا گیا اور کھانا چن دیا گیا۔ سارنگا نے وہیں سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ مجھ سے دو بار اس نے پوچھا کہ مجھے یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میرے لیے یہ سب کیسا جہان حیرت ہے۔

4 بجے اسماعیل نے ناہید کی حویلی کی طرف جانے کے لیے گاڑی لگا دی۔ رنگا دو پہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کے لیے رہائشی حصے کی طرف جا چکا تھا ہم ناہید کے ہاں پہنچے تو اسے اور بوا کو میری گزشتہ شب بسر کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ ناہید بے حد خوش تھی کہ میں نے کہیں اور نہیں اس کے بابا کی طرف منتقلی کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے مجھ سے گلہ بھی کیا میں نے گزشتہ روز ہی اسے اپنے گھر بدری کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا۔ جانے اسے یہ ساری خبریں کون پہنچاتا تھا۔ اسماعیل تو کل رات دیر تک میرے ساتھ ہی تھا۔ شاید دن میں جب میں رنگا سرکار کی عدالت دیکھ رہا تھا کسی وقت وہ یہاں آیا ہو۔ کیونکہ درمیان میں وہ دوسرے کہیں گیا تھا۔ میں نے ناہید کو تسلی دی کہ بابا کا غصہ ختم ہوتے ہی ریحان خود مجھے لینے آجائے گا، لیکن نہ جانے کیوں میرا دل اندر سے کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ گھر اور میرے درمیان فاصلہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ ناہید مجھ سے بار بار پوچھتی رہی کہ اس کے بابا مجھے کیسے لگے؟ انہوں نے میرا ٹھیک سے خیال رکھا یا نہیں۔۔۔۔۔؟ اور میں وہاں خوش تو ہوں؟ وغیرہ وغیرہ اور میں اسے اپنے گزرے دن کے بارے میں بتاتا رہا۔

پھر میں نے خاص طور پر ناہید سے ستارہ کے بارے میں بات کی کیونکہ میں سارنگا سے پہلے ناہید سے ستارہ کی ٹیوشن کے بارے میں اجازت لینا چاہتا تھا۔ ناہید تمام بات سن کر افسردہ ہوگئی ”کیوں آیان بھائی۔۔۔۔۔ آپ مجھے نہیں پڑھانا چاہتے کیا۔۔۔۔۔؟“۔

”ایسی بات نہیں۔۔۔۔۔ وہ لوگ اس وقت ضرورت مند ہیں لہذا انہیں کسی ایسی مدد کی ضرورت ہے کہ ان کی خودداری متاثر نہ ہو، اور اب میرا

اور تمہارا رشتہ ایسے کسی بہانے کا متقاضی بھی تو نہیں..... تمہارا جب جی چاہے میں تمہاری مدد کے لیے یہیں موجود رہوں گا.....“ میری بات سن کر ناہید کے چہرے پر روشنی سی آگئی ”تو پھر ٹھیک ہے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں..... مگر بابا شاید مجھے گھر سے باہر پڑھنے کے لیے نہ جانے دیں.....“

”کوئی بات نہیں..... اس صورت میں اسماعیل روزانہ ستارہ کو یہاں لاسکتا ہے..... جیسے وہ مجھے لے کر آتا ہے.....“

ناہید کی رضامندی کے بعد میں ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ جب اسماعیل مجھے دوبارہ یعقوب مینشن لے کر پہنچا تو ایک اور شام ڈھلنے والی تھی۔

احاطے میں کل شام کی طرح کلائی اور زور کی مشق جاری تھی۔ آج رنگا خود بھی ایک بڑے سے اسٹول پر بیٹھا اپنے کارندوں کو زور سکھا رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک نوجوان نے دوسرے کی کلائی زور سے درمیان میں کچھی میز پر گرا دی۔ فضا میں ہلکی سی ہڈی چنکنے کی آواز ابھری۔ مجھے دیکھ کر سارنگا نے دعوت دی ”کیوں بھی ساجن..... کلائی لڑائے گا میرے شیروں سے..... سنا ہے تجھ میں بڑا دم خم ہے۔ یہ یاد رکھنا پنچہ لڑانے کے لیے صرف کلائی کی نہیں، کلیجے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔“ میں نے ہلکے سے مسکرا کر معذرت کی۔

”نہیں..... آپ کے شیر واقعی سوا سیر ہیں۔ میرا ان سے کیا مقابلہ.....؟“ لیکن موسیٰ نہ مانا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سارنگ کے سامنے کچھی لکڑی کی میز پر بائیں جانب بڑھا دیا۔ ایک نوجوان اپنی کلائی پر ہاتھ پھیرتا ہوا میرے مقابل آکر بیٹھ گیا۔ مجبوراً میں نے اپنا ہاتھ پنچہ لڑانے کے لیے میز پر رکھ دیا۔ نوجوان کی نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں۔



## 1947ء کے مظالم کی کہانی خود مظلوموں کی زبانی

ایسے خون آشام قلب و جگر کو تڑپا دینے والے چشم دید واقعات، جنہیں پڑھ کر ہر آنکھ پر غم ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی خون سے لکھی تحریریں، جنہوں نے پاکستان کے لیے سب کچھ لٹا دیا اور اس مملکت سے ٹوٹ کر پیا کر کیا۔

تو پھر یہی صدا بلند ہوتی ہے کہ..... کیا آزادی کے چراغ خون سے روشن ہوتے ہیں؟ یوم آزادی پاکستان کے موقع پر کتاب گھر کی خصوصی پیش کش..... نوجوان نسل کی آگہی کے لیے کہ یہ وطن عزیز پاکستان ہمارے بزرگوں نے کیا قیمت دے کر حاصل کیا تھا۔

اس کتاب کو کتاب گھر کے تاریخ پاکستان سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## باب 13

سارنگا نے زور سے تالی پٹی ”واہ بھی..... میدان میں تو میرا بڑا سورما اتر رہا ہے۔ چل سینڈو..... دکھا دے اپنا زور اس شہزادے کو.....“

بچپن سے اب تک میں کئی بار ریحان اور اپنے دوستوں کے ساتھ پنجہ لڑانے کا یہ کھیل کھیل چکا تھا، لیکن بالے کے علاوہ مجھے اور کوئی ہرا نہیں پایا تھا۔ بالے کی کلائی میں واقعی بلا کا زور تھا۔ ریحان کو تو میں زبردستی بھی دونوں ہاتھوں سے پنجہ گرا کر ہرا دیتا تھا اور اس کام میں چھوٹی میرا ساتھ دیتی تھی وہ میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا زور بھی ڈال دیتی تھی اور ریحان کو ہارنا ہی پڑتا تھا کیونکہ اگر وہ جیت جاتا تو پھر میں دن بھر منہ پھلائے پھرتا اور ریحان سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ جانے یہ بچپن ایک دم پھر سے اڑ کر کہاں اوجھل ہو جاتا ہے۔

سینڈو نے اپنا پایاں ہاتھ اپنی پشت پر پیچھے مضبوطی سے کس لیا اور مجھے بھی اشارہ کیا کہ میں بھی اسی عمل کو دہراؤں تاکہ صرف دائیں ہاتھ کے پنجے اور کلائی کا زور ہو سکے۔ ہمارے آس پاس موجود باقی سارے شاگرد، کارندے اور ان کے بوڑھے استاد بھی ہمارا یہ بے وزن مقابلہ دیکھنے کے لیے اپنی مشق چھوڑ کر ایک دائرے میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ قاعدے کے مطابق موسیٰ میری طرف سے میرا حوصلہ بڑھانے والا مقرر ہو گیا اور سینڈو کی سرپرستی خود سارنگا نے سنبھال لی۔ میرے حق میں نعرے لگانے والوں کو موسیٰ نے بائیں جانب کھڑا کر دیا اور سینڈو کے حمایتی دائیں جانب اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ گویا باقاعدہ ٹیم بنا کر پنجہ لڑانا بھی یہاں کے آداب و تربیت میں شامل تھا۔ ایسا شاید اس لیے کیا جاتا ہوگا کہ کوئی ایک مقابلہ داد اور جوش کی بنا کی میں تنہا نہ رہ جائے۔ ایسا موقع سارنگا یہاں اپنے دشمنوں کے لیے بھی ضرور فراہم کرتا ہوگا۔ سینڈو نے اپنا پنجہ کھولا اور میں نے اپنی ہتھیلی اس کی ہتھیلی سے جوڑ کر اپنی انگلیاں کس لیں۔ موسیٰ نے گفنی شروع کی۔ تین۔ دو۔ ایک اور اس کی انگلی گرتے ہی فضا میں شور مچ گیا۔ ”شاباش سینڈو..... دس سینڈو سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں..... گرا دے اسے.....“ کوئی میری طرف سے چلایا ”شاباش جوان..... ہمت کرو.....“ گرنے نہ پانے۔ ”سینڈو باسانی میرا ہاتھ میری طرف جھکانے میں کامیاب ہو گیا لیکن میری سطح چھونے سے پہلے ہی میری کلائی نے اپنا زور پکڑ لیا اور میں دھیرے دھیرے سینڈو کا ہاتھ واپس برابر سطح پر لانے میں کامیاب ہو گیا لیکن سینڈو واقعی پنجہ لڑانا جانتا تھا۔ اس نے میری لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنے ہاتھ کو اپنی جانب زیادہ جھکنے نہ دیا۔ میری کن پٹی سے پسینے کی ایک بوند پھوٹی اور دھیرے دھیرے میرے کان کے پیچھے غائب ہو گئی۔ ہم دونوں کے ہاتھوں کی نسیں پھٹنے کو تھیں۔ چاروں طرف شور برپا تھا۔

”بلے بھی بلے..... آج تو سینڈو کو پنجہ دکھانے والا بھی کوئی پیدا ہوا ہے۔ آفرین ہے جوانا.....“ دوسری طرف سے سارنگا نے نعرہ مارا ”کیا کر رہا ہے..... عزت ڈبوئے گا کیا سارے اڈے کی..... اتنا لمبا مت کھینچ.....“ موسیٰ تو باقاعدہ چلا رہا تھا ”واقعی ماں کا دودھ پی کر پلا ہے یہ جوان..... تو ڈال اس سائڈ کی کلائی آج..... ہڈی چٹھا دے سینڈو کی.....“ میں اور سینڈو دونوں پسینے میں تر بہ تر ہو چکے تھے۔ ہماری کہنیوں کے نیچے بھی میز کی سطح میں سے اب باقاعدہ لکڑی کی چرچر اہٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ مجھے آس پاس صرف ایک سرخ اندھیرا دکھائی دے رہا تھا اور میری



پوری حیات سمٹ کر صرف میری کلائی کے اندر ساگئی تھیں۔ پھر اچانک سینڈو نے ہاتھ کو ایک لمحے کے لیے کچھ ڈھیلا چھوڑا اور میری توجہ نئی اور شاید یہ میری غلطی تھی کیونکہ دوسرے ہی لمحے سینڈو میرا بازو میز کی سطح پر گرا چکا تھا۔ ماحول نعروں اور چیخوں سے گونج اٹھا۔ اڑے کا سینڈو جیت چکا تھا لیکن سارنگا کا موڈ اب بھی خراب تھا۔ اس نے قریب پڑی لکڑی کی ایک پلیٹ اٹھا کر سینڈو کی کمر پر دے ماری ”حرام خور..... پورے ڈھائی منٹ لگا دیے تو نے..... چربی چڑھ گئی ہے تیرے جسم پر..... اتارنی پڑے گی..... اتنی دیر میں تو پہلے دس بندے گرا دیتا تھا“ سینڈو نے مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میری کلائی تمام کر مجھے کھڑا کر دیا ”اس میں بڑا دم ہے بھائی..... یہ ان میں سے نہیں ہے۔“ موسیٰ نے بھی میرے بازو سہلائے..... ”جی خوش کر دیا تم نے آج.....“ سارنگا نے جیب سے ہزار کا نوٹ نکالا، اور مجھ پر وار کر کسی خدمت گار کو تھما دیا ”جانتا ہے تو سینڈو سے کیوں ہار گیا.....؟.....“

”کیونکہ سینڈو مجھ سے بہتر پنجہ باز ہے.....“ سارنگا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں..... اس لیے کہ عین آخری لمحے میں تیری نظر اس کی نظر سے ہٹ گئی تھی“ میں نے حیرت سے سارنگا کی طرف دیکھا ”کیا مطلب ہے؟..... مقابلہ تو کلائی کے زور کا ہو رہا تھا۔ پھر نظر کا نظر سے کیا واسطہ.....؟.....“

سارنگا نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بیٹھایا۔ ”نظر کا ہی تو سارا کھیل ہے پیارے..... پنجہ آزمائی میں جتنا کلائی کا زور درکار ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ اپنے مقابل کی نظر پہچاننا بھی ضروری ہے.....“ میں حیرت سے سارنگا کی بات سنتا رہا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ پنجہ آزمائی کے دوران حریف ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے ایک دوسرے کو آخری لمحے تک گھورتے کیوں ہیں۔ اصل میں وہ دوسرے کی نظر پڑھ رہے ہوتے ہیں ہاتھ تو دماغ کی ہدایت پر اپنی پوری توانائی کا زور صرف کر رہی رہا ہوتا ہے لیکن مقابل کی نظریہ بتاتی ہے کہ وہ کس وقت اپنی کلائی کو کس انداز میں جھٹکے گا یا ساکت رکھے گا۔ نظر سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اگلا حریف اب اس مقام پر ہے جہاں ایک آخری جھٹکا اس کی کلائی کو گرا سکتا ہے۔ غرض یہ صرف کلائی سے کلائی کی نہیں..... بلکہ آنکھ سے آنکھ کی بھی برابری لڑائی ہوتی ہے..... سارنگا کے جانے کے بعد موسیٰ نے وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے پنجہ آزمائی کے چند گر بھی بتا دیے اور مجھے مشق کرتے رہنے کی تلقین بھی کی۔

بعد میں اسماعیل نے مجھے بتایا کہ موسیٰ خود ایک زمانے میں شہر کا سب سے بڑا چاقو باز رہ چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بجلی کی سی تیزی اور پھرتی تھی کہ مقابل کو سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا اور وہ اپنی شہ رگ سے خون کے فوارے بلند ہوتے دیکھتا تھا۔ اسماعیل نے مجھے چاقو بازی کے کہنے اصولوں سے بھی روشناس کروایا کہ اچھا چاقو باز کبھی جلدی میں اور اوچھا دار نہیں کرتا اور اگر وہ ماہر بھی ہو تو اگلے کے جسم پر لگا چاقو کا ہر زخم اور نشان ہمیشہ کے لیے اس کی نیک یادنامی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ کیونکہ ماہر کو ہمیشہ ناپ تول کر دار کرنا ہوتا ہے کسی مستند جراح کی طرح، اور اس کی مشق کا ایک عام پیمانہ یا امتحان یہ رکھا جاتا ہے کہ اسے مختلف جسموں کے کسی ایک مخصوص حصے پر ایک ہی ناپ اور سائز کا زخم لگانے کا کہا جاتا ہے اور بعد میں اگر ان دس بارہ زخموں سے ایک سنی میٹر بھی کم یا زیادہ ہو تو اسے ماہر کی گلدی سے اتار دیا جاتا ہے۔ یا پھر سے امتحان میں شریک ہونے کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے۔

ایک اور بڑی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک ماہر سرجن یا جراح کی طرح اچھا چاقو باز چاہے تو اپنے زخم کا نشان نہیں چھوڑتا وہ ہر وار جسم پر اپنی قدرتی لکیروں (Body lines) کے متوازی کرتا ہے اور زخم بھرنے پر زخم کا زہر برابر نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوئی تجربہ کار پلاسٹک سرجن کسی مریض کی پلاسٹک سرجری کرتا ہے۔ بقول اسماعیل نے لڑکوں کو مشق کراتے ان عمر رسیدہ استادوں میں اب بھی ایسے کئی چاقو باز موجود تھے جو اڑتی کبھی کو بھی نشان بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ میں نے اسماعیل سے درخواست کی کہ کیا میں اگر اس فن کی کوئی سادہ بدھ حاصل کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں، لیکن اسماعیل نے نفی میں جواب دیا کہ صرف چند مشقوں کی حد تک تو ٹھیک ہے ورنہ باقاعدہ یہ فن چاقو بازی سیکھنے کے لیے مجھے اڑے سے وفاداری کا حلف اٹھانا ہوگا اور کسی ایک استاد کو باقاعدہ اپنا استاد مان کر اور بھینٹ چڑھا کر اس کی شاگردی میں آنا ضروری ہوگا ورنہ اس دنیا کے ریتی رواج اور اصول میرے آڑے آجائیں گے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اسماعیل نے مجھے پان کی پیش کش کے لیے باہر جانے کا پوچھا۔ مجھے یاد آیا کہ سارنگا سے پہلی ملاقات کی رات وہ بھی موسیٰ کے ساتھ کیفے فراق سے اگلے چوراہے پر جتنی شہر کی مشہور پان کی دوکان سے ہی پلٹ رہے تھے جب موسیٰ نے مجھے سڑک کنارے دیکھا تھا۔ میں نے اسماعیل کے سامنے شرط رکھی کہ اگر وہ کیفے فراق کے اگلے چوراہے تک لے چلے تو مجھے پان کی یہ پیش کش منظور ہے۔ اسماعیل میرا مدعا سمجھ کر مسکرا دیا اور کچھ دیر بعد ہم گاڑی میں سوار شہر کی سنسان سڑکیں ناپ رہے تھے۔

اسماعیل نے پان خریدنے کے بعد واپسی پر گاڑی کیفے فراق کے سامنے کھڑی کر دی۔ مرزا نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا میری جانب آیا۔ مجھے گھر سے نکلے بمشکل اڑتالیس گھنٹے ہوئے تھے لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے میں اڑتالیس سال بعد کیفے فراق آیا ہوں۔

مرزا آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا ”انویار..... کہاں چلے گئے تھے تم.....“ میں نے اس سے راجہ اور بالے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں مشی کے پاس ہسپتال گئے ہیں لیکن میرے لیے پیغام چھوڑ گئے ہیں کہ میں جب بھی آؤں تو مرزا کے ساتھ کوئی وقت ضرور ملے گا کہ میں جب ہماری ملاقات ہو سکے۔ میں نے مرزا سے کہا کہ کل کا پتہ نہیں لہذا میں ابھی ہسپتال سے ہوا آتا ہوں۔ میں نے مرزا کو ریحان کے لیے پیغام بھی دیا کہ میں ٹھیک ہوں میری فکر نہ کرے۔ میں نے اسماعیل کو ہسپتال چلنے کا کہا۔ میں دل ہی دل میں یہ دعا کر رہا تھا کہ وارڈ میں مجھے مشی کے ابایا ملے گا کوئی دوسرا بزرگ نڈل جائے۔ اس وقت میں کوئی وضاحت دینے کی حالت میں نہیں تھا۔

میری دعائیں رنگ لائیں اور مجھے راہداری کے شیشے والے دروازے سے اندر صرف راجہ اور بالائی نظر آئے۔ وہ دونوں مجھ پر نظر پڑتے ہی یوں اچھل کر کھڑے ہو گئے جیسے انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو چکی تھی ”کہاں تھے تم..... تمہیں پتہ بھی ہے ہم کتنے پریشان تھے، تمہیں تو بس سدا سے اپنی من مانی کا شوق ہے نا، ہماری پرواہ کسے.....؟“ ان کے شور سے گھبرا کر مشی نے بھی اپنی بند آنکھیں کھول دیں۔ اس کی حالت اب کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں دوسرے مریضوں کا واسطہ دے کر چپ کرایا۔ ”ٹھیک ہے ہم شو نہیں کریں گے مگر یہ بتاؤ کہ تم دو دن سے غائب کہاں ہو..... اور رات کہاں گزاری تم نے.....“



”میں سارنگا کے یعقوب مینشن میں تھا۔۔۔۔۔“ میری بات سن کر پہلے تو وہ کچھ سمجھے ہی نہیں اور پھر جب انہیں سمجھ میں آیا کہ میں نے کیا کہا ہے تو جیسے ان کے سروں پر کسی نے زوردار بم پھوڑ دیا۔ اس مرتبہ چلانے والوں میں مٹی خود بھی شامل تھا۔ ان کی آوازیں سن کر ڈیوٹی پر موجود نرس گھبرا کر ڈیوٹی روم سے بھاگتی ہوئی مٹی کے بستر کی جانب آگئی اور پھر اس نے تینوں کی وہ خبر لی کہ انہیں معافی مانگتے ہی بنی ورنہ وہ شاف انہیں وارڈ بدر کرنے پر ہی مصرقی۔ ان تینوں کی آوازاں بھلے ہی دھیمی ہو چکی تھیں مگر ان کے تاثرات اب بھی انتہائی اونچے (Loud) تھے۔ میں نے الف سے لے کر ی تک ساری کہانی انہیں سنادی۔ کچھ دیر تک وہ سب خاموش رہے پھر رجب نے پہل کی ”لیکن یار انو۔۔۔۔۔ لوگ تو یہی کہیں گے ناکہ کل تک جس رنگا کے خلاف ہم لڑ رہے تھے۔ آج ہمارا یاد اسی رنگا بھائی کے گھر میں رہ رہا ہے“ میں نے ان کی طرف دیکھا ”لوگوں کی پرواہ کسے ہے؟۔۔۔۔۔ اور وہ شوکی جسے ہم رنگا کا خاص آدمی سمجھتے تھے وہ تو اس کے احاطے کے سو کوس دور بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ اچکا پن شہر میں اور بھی بہت سی جگہوں پر سارنگا کے نام پر ہوتا ہوگا۔ میں اس جگہ یا ان لوگوں کی حمایت نہیں کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن سچ یہی ہے کہ ہم جو انہیں سمجھتے ہیں وہ لوگ اس سے بہت مختلف ہیں۔۔۔۔۔“ بالے نے دھیرے سے کہا ”ویسے جس دن سے ہم تھانے سے چھوٹ کر آئے ہیں۔ علاقہ میں زبردستی بھتہ یا ہفتہ لینے کے لیے کوئی پارٹی نہیں آئی۔۔۔۔۔ اب تم نے بتایا ہے تو پتہ چلا ہے ورنہ آس پاس کے سبھی دوکاندار اسے ہمارا ہی کارنامہ سمجھ رہے تھے۔۔۔۔۔“

”چلو چاہے جیسے بھی کہی پر یہاں کے لوگوں نے سکون کا سانس تو لیا۔۔۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب دوبارہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ جب تک سارنگا کے پاس یہ علاقہ ہے تب تک تو ہرگز نہیں۔۔۔۔۔“

تب ہی رجب کی زبان سے ایک ایسا سوال نکل گیا جس کا جواب اس وقت ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔

”لیکن جب یہ علاقہ سارنگا کے ہاتھ سے نکل گیا تب کیا ہوگا؟“ ہم سب ہی چپ ہو گئے۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا ”اس سے پہلے ہمیں یہ علاقہ اپنے نام کرنا ہوگا۔ اس مسئلے کا سبب یہی ایک صل ہے۔۔۔۔۔“ میرے پھیلے ہاتھ پر تین ہاتھ اور آگرے اور ہم چاروں نے آج تک زندگی میں ایسے بہت سے عہد ایک دوسرے کے ساتھ کیے تھے اور ہم چاروں جانتے تھے کہ اب یہ عہد پورا کرنا ہم چاروں کا فرض بن چکا ہے۔

میں بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسماعیل کے خیال کی وجہ سے وہاں سے اٹھ آیا۔ اسماعیل آرام سے سیٹ سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے اس کا کاندھا ہلایا ”آگے بابو۔۔۔۔۔ مل لیا دوستوں سے۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ مگر میں نے تمہیں بے آرام کر دیا۔۔۔۔۔“

”ارے نہیں۔۔۔۔۔ ڈرائیور کا تو کام ہی انتظار کرنا ہے۔۔۔۔۔ اور سچ بتاؤں۔۔۔۔۔ جب تم اپنے دوستوں سے ملے ہو تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی کبھی یاروں کا یا رہا تھا۔ پھر وقت نے ایسے پھیر دیے کہ سارے دوست ایک ایک کر کے چھوٹنے لگے، لیکن تم اپنے دوستوں کو کبھی نہ چھوڑنا آیا ان بابو۔۔۔۔۔ یہی ایک وہ رشتہ ہے جو ہم خود بناتے ہیں۔ باقی تو بنے بنائے ملتے ہیں اور بس بھانے پڑتے ہیں۔“

ہم یعقوب مینشن پہنچے تو رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ احاطے میں صبح سویرے کی مشق کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہم کار سے اترے تو میں نے چند بزرگوں کو دودھ کی سہیل والی جگہ پر بنی پانی کی بڑی ٹینکی کے نیچے وضو کرتے دیکھا۔ کچھ دور چند حضرات صفیں بچھا رہے تھے۔

گویا یہاں نمازی حضرات کے لیے نماز ادا کرنے کا بھی مکمل بندوبست موجود تھا۔

اگلہ دن جمعہ کا تھا۔ میں نے اسماعیل سے کہا کہ مجھے صبح ساڑھے دس بجے تک کچھ دیر کے لیے سادات محلے جانا ہے لہذا اگر وہ مجھے یہاں نہ پائے تو پریشان نہ ہو، لیکن جب صبح ساڑھے دس بجے کے قریب میں باہر نکلے لگا تو اسماعیل گاڑی لیے تیار کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا ”آیاں بابو..... ڈرائیور حاضر ہے۔“

”لیکن تم نے کیوں تکلیف کی..... میں چلا جاتا..... ہماری غیر موجودگی میں کسی کو گاڑی کی ضرورت بھی تو پڑ سکتی ہے.....؟“

اسماعیل نے گاڑی گیس میں ڈال دی..... ”نہیں..... یہ گاڑی صرف ناہید بٹیا کی ڈیوٹی پر ہے اور بٹیا نے اسے اب تمہاری ڈیوٹی پر لگا دیا ہے کیونکہ اسے خود تو کہیں جانا نہیں ہوتا۔ بس کبھی کبھار شہر کی بڑی لائبریری تک جانا ہو تو فون کر کے مجھے بلا لیتی ہے.....“

کچھ دیر بعد ہم سادات محلے میں داخل ہوئے تو کچھ لوگوں کی نظریں اس بڑی گاڑی کو شیخ صاحب کے دروازے کے قریب رکستے دیکھ کر اٹھیں..... دروازہ خود شیخ صاحب نے کھولا اور مجھے دیکھتے ہی حسب معمول ان کا چہرہ کھل گیا۔ میں نے بیٹھک میں بیٹھتے ہی سب سے پہلے ستارہ کی ٹیوشن کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کے چہرے پر بہت سی سوچوں کی لکیریں ابھر آئیں۔

”ہاں میاں..... شیخانی جی نے ذکر تو کیا تھا ستارہ کی اس خواہش کا۔ پر تمہیں سچ بتاؤں تو میرا دل نہیں مانتا۔ اور پھر اگر ان کے بڑے بھائی یعنی میرے صاحبزادے حمید کو اس بات کی خبر ہوئی کہ اس کی بہن نے ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی ہے تو یقیناً جانو وہ بہت ناراض ہوگا۔ وہ اس معاملے میں بہت سخت مزاج ہے..... اور اب اس کے یہاں آنے میں کچھ زیادہ دن بھی باقی نہیں ہیں“ تویر بھی کچھ دیر میں بیٹھک میں آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ وہی ٹیوشن ہے جو اس نے مجھے دلائی تھی۔ سینہ داؤد کی صاحبزادی والی..... لیکن جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ ناہید اصل میں سارنگا کی بیٹی ہے تو ان دونوں کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ شیخ صاحب نے سوچنے اور سب سے مشورہ کرنے کے لیے مجھ سے کچھ وقت مانگ لیا۔ کچھ دیر میں چائے بھی آ گئی مگر وہ جسے میری نظریں غیر ارادی طور پر ہمیشہ ڈھونڈتی رہتی تھیں آج وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر رخصت ہوتے وقت شیخانی جی نے ہی یہ عقدہ کھولا کہ ستارہ اور گہنا دونوں ہی پڑوس میں کسی کے بے حد اصرار پر ان سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔ میں بھاری دل کے ساتھ یعقوب مینشن پہنچا تو وہاں کچھ عید کا سماں تھا۔ مختلف اہل کار، شاگرد اور استاد سروں پر فلسطینی رومال باندھے اور صاف ستھرے کپڑے پہنے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ اسماعیل نے سر پر ہاتھ مارا ”اوہو..... شکر ہے ہم وقت پر واپس آ گئے..... آج تو جمعۃ المبارک ہے.....“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”ہاں..... تو.....؟“۔

”چلو تم بھی جلدی سے نہادھو کر تیار ہو جاؤ۔ آج کے دن ہم سب رنگ بھائی کے ساتھ جامع مسجد جاتے ہیں نماز پڑھنے..... یہاں جمعہ کو خاص تیاری ہوتی ہے.....“ مجھے حیرت ہوئی کہ ہفتے کے باقی چھ دن کی نمازیں ضائع کر دینے والا رنگا جمعہ کو اس قدر اہتمام سے کیوں مناتا ہے۔

کچھ دیر بعد جب میں لباس تبدیل کر کے باہر احاطے میں آیا تو سبھی گاڑیاں لگ چکی تھیں۔ جلد ہی سامنے سے رنگا، موسیٰ سمیت آنا نظر آیا۔ رنگا نے بھی سر پر چار خانے کا مخصوص فلسطینی رومال باندھ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی تسبیح تھی۔ آنکھوں میں سرے کی دھار کچھ



زیادہ گہری اور لباس میں خاص اہتمام۔ اس نے مجھے احاطے میں گم سم کھڑے دیکھا تو اشارے سے مجھے اپنی بڑی دین نما گاڑی میں بلا لیا جس میں اس کے خاص محافظ موسیٰ سمیت پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ دین کے پیچھے باقی ساری گاڑیاں بھی چل پڑیں لیکن گیٹ سے نکلنے ہی ایک اور انہونی ہماری منتظر کھڑی ملی۔ سامنے پولیس کی بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان سب کی سربراہی اے ایس پی بلال کر رہا تھا۔ یہ وہی اے ایس پی تھا جو کبھی میرے ابا کا شاگرد رہ چکا تھا اور جس کے تھانے میں ہماری گرفتاری ڈالی گئی تھی۔

گاڑیاں رک گئیں۔ ہم گاڑیوں سے اترے اور اے ایس پی کی نظریں مجھے رنگا کی دین سے اترتے دیکھ کر حیرت سے پھیلائی گئیں۔



## کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/مؤلف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو نمٹک کے معروف پبلشرز ”علم و عرفان پبلشرز“ کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب نائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک۔ کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجئے اور کتاب لیجئے۔

خواتین کے لیے سنہری موقع..... سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق.....

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں.....

عمیرہ احمد	ماہ ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنول نازی	گگت عبداللہ	رفعت سراج	نبیلہ عزیز	گگت سیما	میمونہ خورشید علی
اقراء صغیر احمد	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔ اے۔ راحت	اعتبار ساجد	شیما جمید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحق حق	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایس۔ ایم۔ ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور۔ [ilmoirfanpublishers@yahoo.com](mailto:ilmoirfanpublishers@yahoo.com)

## باب 14

سارنگا کے محافظوں نے فوراً اپنی بندوقین اور پستول لوڈ کر لیے لیکن سارنگا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ اے ایس پی مجھے رنگا کے ساتھ دیکھنے کی حیرت کے پہلے جھٹکے سے باہر آچکا تھا۔ رنگا نے اس سے پوچھا ”کیوں بھائی..... یہ باہر کیوں بازار لگا رکھا ہے..... کوئی کام تھا تو اندر آ جاتا۔“ بلال شاید رنگا کی حیثیت سے واقف تھا ”اندر آنے کا وقت آیا تو وہاں تک بھی ضرور آئیں گے۔ فی الحال تو ہم ایک اشتہاری کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسی علاقے میں غائب ہو گیا ہے مجھے شک ہے کہ وہ اسی مینشن میں جا کر چھپ گیا ہے۔“

رنگا نے مسکرا کر موسیٰ کی جانب دیکھا ”اے موسیٰ..... تو یہاں اشتہاریوں کو بھی پناہ دیتا ہے؟..... کم از کم ان سے روز کا بھڑا ہی لے لیا کر.....“ رنگا کی بات پر ایک زوردار قہقہہ فضا میں گونجا..... بلال نے خون کے گھونٹ پی کر ہم سب کی طرف دیکھا..... ”ساری دنیا جانتی ہے کہ علاقے کا ہر اشتہاری اسی حویلی کی بھول بھلیوں کی طرف آ کر گم ہو جاتا ہے.....“ سارنگا نے اسے دعوت دی ”چل اگر تجھے اتنا ہی شک ہے تو دور کر لے اپنا دوسرہ..... جا کر اندر تلاشی لے لے..... مگر پہلے اپنے بڑوں سے کاغذ لے آ.....“ اے ایس پی نے سر دلچے میں کہا ”سرچ وارنٹ بھی لے آؤں گا ایک دن..... اور یاد رکھنا..... وہ دن ان سب اشتہاریوں کا آخری دن ہوگا.....“ موسیٰ نے لقمہ دیا ”ٹھیک ہے بڑے صاحب..... ہم ابھی جمعہ کی نماز کے لیے جا رہے ہیں..... تیرے لیے بھی دعا ڈالتے آئیں گے۔“ موسیٰ کی بات پر سب کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ سارنگا نے سب کو گاڑیوں میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں واپس پلٹنے لگا تو بلال نے آواز دے کر مجھے روک لیا..... ”بات سنو.....“ میں دو قدم بڑھ کر اس کے قریب آ گیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا ”تم تو قیر احمد صاحب کے بیٹے ہو ناں..... کیا نام تھا تمہارا.....“ بلال نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کر دی ”آیان..... آیان احمد نام ہے میرا.....“ بلال نے مجھ پر طنزیہ نظریں ڈالیں..... ”ہاں..... آیان..... تمہیں تمہارے محلے میں انوکھتے ہیں ناں.....؟“ خوب..... آیان سے انودا دا بننے میں بڑا کم وقت لگایا تم نے..... تمہی نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اسی سارنگا کے آدمیوں کو پیٹنے کا دعویٰ کیا تھا..... بڑی جلدی تم نے اپنا ٹریک بدل لیا.....“ میں چپ رہا۔ میرے دوستوں کے خدشات سچ ثابت ہونا شروع ہو گئے۔ مجھے دین میں سے موسیٰ نے آواز دی۔ ”چل شہزادے..... دیر ہو رہی ہے.....“ میں پلٹا اور پھر کچھ سوچ کر رک گیا اور بلال کی جانب مڑا ”تم نے اس روز بھی میری بے گناہی پر یقین نہیں کیا تھا اور آج بھی تم تصویر کا ایک رخ ہی دیکھ رہے ہو۔ اس روز ہم چلاتے رہے کہ ہماری جنگ ایک بہتہ خور کے خلاف تھی لیکن تمہاری وروی نے شوکی کا ساتھ دیا تھا۔ آج جب میں اسی شوکی کی جگہ کھڑا ہوں تو تمہارے اعتماد کو کیا ہو گیا.....؟“ میں بات ختم کر کے لمبے لمبے قدم لیتا ہوا دین میں جا کر بیٹھ گیا۔ گاڑیاں آگے بڑھ گئیں۔ سارنگا نے اپنی تسبیح ختم کر کے مجھ سے پوچھا

”کیوں ساجن..... کیا بول رہا تھا وہ پولیس والا.....“

”وہ میرے ابا کا پرانا شاگرد ہے۔ مجھے آپ لوگوں کے ساتھ دیکھ کر اپنی حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔“ رنگا نے گہری سانس لی ”کیا کریں بھیا..... اپنا تو



مقدور ہی اتنا سیاہ ہے کہ جو رادری ہمارے ساتھ بیٹھ جائے اس کو بھی کالک چاٹ جاتی ہے۔“

وین میں گہری خاموشی طاری ہو گئی صرف کناروں پر لگے چھوٹے پنکھوں کی ہوا۔ گاڑی کے اے سی کی ٹھنڈک کے ساتھ مل کر کھینچوں کی جھنجھٹ جیسی آواز پیدا کرتی رہی۔ تھوڑی دیر میں ہی ہم جامع مسجد کے باہر پہنچ گئے۔ نمازیوں کے ہجوم میں سے بہت سوں کے ساتھ سارنگا کی اچھی خاصی شناسائی ظاہر کرتی تھی کہ وہ ہمیشہ یہیں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے آتا ہے۔

نماز ختم ہوئی تو مسجد کے وسیع و عریض سنگ مرمر کے فرش والے محن میں اور باہر مرکزی دروازے کی روش کی جانب سینکڑوں بھکاریوں اور ضرورت مندوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اڈے کے تین نو جوان نکلے اور بیٹھے چاول کی کئی دیکھیں کھلی گاڑیوں میں لے کر مسجد کے باہر پہنچ گئے اور سارنگا اور موسیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی پرات نما تھا لیوں سے چاول نکال کر سب لوگوں میں بانٹنے کا عمل شروع کر دیا۔ پھر جلد ہی افتتاح کے کچھ دیر بعد دیگر کارندوں نے یہ ڈیوٹی سنبھال لی اور سارنگا موسیٰ سمیت ان سب کی گمرانی کرتا رہا۔ اس دوران رنگا نے بہت سے لوگوں کی ٹھنڈوں میں بنا کچھ دیکھے کچھ روپے منتقل کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات نے ایک دم ہی سر اٹھانا شروع کر دیا۔

تقریباً سہ پہر چار بجے کے قریب یہ مشق ختم ہوئی اور ہم سب یعقوب مینشن پہنچ گئے۔ ہمارے داخل ہوتے ہی وہاں بھی دسترخوان بچھ گیا اور سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے اسماعیل کو ناہید کی طرف چلنے کا اشارہ کیا تو سارنگا نے کہا ”ظہر جا سا جن..... آج اپنی بھی باری ہے اپنی لاڈلی کے گھر پھر اڈا لے لی..... اسٹھے چلیں گے.....“

اسماعیل نے مجھے بتایا کہ رنگا بھائی زیادہ تر جمعہ کو ہی ناہید سے ملنے جاتا ہے کیونکہ باقی دن اسے اپنی سرکار کے معاملات سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔ ہم اسماعیل کی گاڑی میں یعقوب مینشن سے نکلے تو رنگا کی دین نے بھی ہماری راہ پکڑ لی۔ شاید اس میں دوسرے محافظ موجود تھے۔ موسیٰ البتہ ہماری گاڑی میں بیٹھا رہا۔ تب اچانک میرے ذہن کے پردے پر ایک جھماکا ہوا کہ جس رات میں کیفے فراق کے باہر پہلی مرتبہ سارنگا سے ملا تھا تب بھی یہی وین سڑک کی دوسری جانب کھڑی تھی مگر میں اس وقت اسے کسی دوسرے فرد کی سواری سمجھا تھا۔ مطلب سارنگا کے گرد چوٹیں گھٹنے اس کے جان نثاروں کا پہرہ رہتا ہے۔

ہم ناہید کی حویلی میں داخل ہوئے تو ہم سب کو ایک ساتھ دیکھ کر خوشی کے مارے اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ بوا بھی چاروں طرف بھاگ بھاگ کر احکامات جاری کرتی رہی۔ موسیٰ ناہید کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور دعا دے کر واپس باہر دیگر محافظوں کی جانب چلا گیا، اور پھر سارنگا نے قبوے اور خشک میوے کی ٹرے رکھ کر واپس لپکتی ناہید کی کلائی پکڑ لی۔ ”یہ سب رہنے دے لاڈلی..... تیرا بوا ایہاں تجھ سے ملنے آتا ہے اور تو سارا وقت یہ خوان ڈھلائی کرنے میں ہی گزار دیتی ہے۔ اب یہاں چکی بیٹھی رہ میرے پاس.....“

ناہید ہنس دی ”بابا آپ بھی تو مہمانوں کی طرح آتے ہیں ناں ہفتے میں صرف ایک بار..... تو پھر خاطر مدارات تو بنتی ہے نا..... اور آج تو میرے لیے دوہری خوشی ہے کہ آپ کے ساتھ آیاں بھیا بھی آئے ہیں..... میرے لیے آج کا دن بہت بہت خاص ہے.....“ سارنگا نے پیار سے ناہید کو کھینچ کر اپنے قریب کر لیا اور بوا سے شکوہ کیا ”یہ کیا بڑی بی..... تو اپنی لاڈلی کو ٹھیک سے کھلاتی پلاتی نہیں ہے کیا..... کیسی سوکھ کر ہڈیوں کا ہار ہوئے جا رہی ہے.....“ بوا کو شکایت کا موقع مل گیا ”یہ کچھ کھائے پئے تو میں اسے کھلاؤں نا یعقوب..... یہ تو بس پانی پر زندہ ہے.....“ بوا کے لہجے

سے لگ رہا تھا کہ وہ ضرور کبھی سارنگا کی بزرگ بھی رہی ہوگی۔ ناہید نے لاڈ سے اپنے باپ سے پوچھا ”بابا آپ کو میرے آیان بھائی کیسے لگے..... بالکل سلمان بھیسا جیسے ہیں ناں.....“

سارنگا کی آنکھوں میں غم کی ایک لہری آ کر گزر گئی لیکن فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا ”ہاں ری..... ویسا ہی ضدی ہے..... اکھڑ اور من موچی.....“ ناہید خوش ہو گئی ”دیکھا..... میں نے کہا تھا نا بھائی..... بابا کو بھی ایسا ہی لگتا ہے“ ناہید شاید دوری کی وجہ سے سن نہیں پائی مگر میں نے سارنگا کی وہ زیر لب بڑبڑاہٹ سن لی کیونکہ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ سارنگا کا لہجہ دعائیہ تھا ”ہاں..... پر خدا نہ کرے اس کا نصیب بھی اس جیسا ہو.....“ ناہید اور بوانے ہمیں رات کے کھانے سے پہلے واپس جانے نہیں دیا۔ درمیان میں ستارہ کی ٹیوشن کا ذکر بھی آیا۔ سارنگا کو اس کے ناہید کے گھر آ کر پڑھانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر وہ ناہید کے گھر سے نکلنے کے خلاف تھا اور اس کی وجہ بھی بہت واضح تھی۔ سادات محلے میں ناہید کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرنے میں بہت سی الجھنیں درپیش تھیں کیونکہ وہ ایک چھوٹا سا محلہ تھا اور وہاں روزانہ ایک مخصوص وقت پر اتنے محافظوں کی بھیڑ بھاڑ اور گاڑیوں کا آنا جانا خود محلے والوں کے لیے ایک اچھی خاصی زحمت کا باعث بن سکتا تھا۔

ہم ناہید کی حویلی سے نکلے تو رات سر پر تھی۔ موٹی نے واپسی کے لیے ڈرائیور کو دوسرا راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ یعقوب مینشن کے دربان نے ہمیں داخل ہوتے ہی بتا دیا کہ کچھ خاص مہمان بڑے مہمان خانے میں سارنگا کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی رہائش کی طرف قدم بڑھائے تو سارنگا نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ساتھ لیے بڑے مہمان خانے کی طرف بڑھ گیا جہاں میں اس سے پہلے نہیں گیا تھا۔

وہ دراصل ایک بہت بڑا ڈرائنگ روم نما ہال تھا جس میں بنا جوڑ کے ایک بہت بڑا اور قیمتی قالین فرش کو ڈھانپے ہوئے تھا اور چاروں جانب صوفے لگے ہوئے تھے۔ چھت کے درمیان میں نلکے فانوس سے چھن کر آنے والی روشنی کچھ اس زاویے سے زمین تک پہنچ رہی تھی کہ ماحول روشن ہونے کے باوجود خواب ناک سا تھا۔ آنے والے مہمان دو عمر رسیدہ شخص تھے جن کے لباس کی نفاست اور رکھ رکھاؤ سے ان کی حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ایک شخص سفاری سوٹ اور دوسرا قیمتی شیر وانی میں ملبوس تھا۔ دربان کے مطابق وہ لوگ مغرب سے بھی پہلے ہمارے انتظار میں یہاں آ بیٹھے تھے۔ سلام دعا کے بعد سفاری سوٹ میں ملبوس شخص نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر موٹی کو دیا جو اس نے سارنگا کو تھما دیا۔ سارنگا نے کارڈ پر نظر ڈالی اور پھر اسے جیسے کچھ یاد آ گیا۔

”ہاں ہاں..... مجھے بولا تھا ابراہیم نے کہ کچھ مہمان آنے کو ہیں..... پروہ تو کسی نواب صاحب کا ذکر کرتا تھا.....“

سفاری سوٹ والے نے شیر وانی والے صاحب کی طرف اشارہ کیا ”جی..... یہی ہیں میرے دوست نواب دبیر الملک..... شہر کے شمالی علاقے میں جو کاشانہ زمر دہے، وہ انہی کا ہے.....“

سارنگا نے جلدی سے بات کاٹی..... ”کاشانہ کیا بولتے ہو صاحب..... وہ تو پورا محل ہے..... سنا ہے ابھی تین سال پہلے ہی اس کا سودا طے ہوا تھا۔ اچھا تو یہ ہیں وہ نواب صاحب جو بھوپال سے تشریف لائے ہیں۔“

نواب نے پہلی مرتبہ زبان کھولی ”بھوپال تو آباؤ اجداد کی راج دھانی تھی جناب..... میری پیدائش اور تعلیم ساری باہر کی ہے..... بس

قسمت میں اس شہر کا دانہ پانی لکھا تھا تو یہیں آکر بس گئے۔ میری زندگی کا زیادہ عرصہ ایران کے شہر تہران میں گزرا ہے۔ وہاں زمرد کی کانیں تھیں ہماری.....“ نواب صاحب اپنی اور کاروبار کی باتیں بتاتے رہے جنہیں سارنگا غور سے سنتا رہا۔ شاید جس ابراہیم نے نواب کو ہماری طرف بھیجا تھا وہ سارنگا کو بہت عزیز تھا کیونکہ میں نے اب تک سارنگا کو کسی اجنبی کو اتنا وقت دینے نہیں دیکھا تھا۔“ تو نواب صاحب..... ابھی ہم کو بولو کہ کیا خدمت کریں آپ کی..... کہیں وہاں کسی حرام خورد نے آپ کے گل میں کوئی پرچی درچی تو نہیں ڈال دی اگر ایسا ہے تو رنگا کو بس حکم کر دو.....“ نواب نے جلدی سے رنگا کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔“ نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں.....“ سارنگا کو کچھ اطمینان سا ہوا۔“ اچھا تو پھر کسی مصیبت میں ہو تو بولو..... کسی کو اٹھانا ہے یا کسی کا سر کاٹنا ہے..... زمین چاہئے یا پھر طاقت..... رنگا حاضر ہے.....“

نواب دبیر نے اپنے دوست کی طرف دیکھا جس نے اپنا نام کمال پاشا بتایا تھا۔ پاشا صاحب نے ہلکے سے کھٹاکر وضاحت کی۔ ”وہ دراصل رنگ بھائی..... معاملہ کچھ ذاتی ہے..... تو اس لیے.....“ رنگا نے بات سمجھ کر دروازے پر کھڑے محافظوں اور چائے کافی پیش کرتے خدمت گاروں کو اشارہ کیا اور پل بھر میں ہی وہ سب وہاں سے جا چکے تھے۔“ جی نواب صاحب..... ابھی بولو آپ..... اب صرف وہ لوگ باقی ہیں جو رنگا کے اپنے ہیں.....“ میں نے موسیٰ سے نظروں ہی نظروں میں وہاں سے اپنے اٹھنے کی اجازت طلب کی لیکن اس نے مجھے وہیں بیٹھنے رہنے کا اشارہ کیا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ سارنگامیری وجہ سے کسی تکلف کا مظاہرہ کرے لیکن سارنگا نے مجھے اٹھ کر پیچھے جاتے دیکھ لیا ”بیٹھ جا رہے..... اب تجھ سے کیا چھپا ہے..... حیب کا بیٹھارہ.....“

میں خاموشی سے دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ نواب صاحب نے گلا صاف کر کے اپنا مدعا بیان کیا جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ وہ ان کی ایرانی بیگم اور بیٹی اور پچھلی بیوی سے ان کے دو بیٹے سب ہی کا شانہ زمرہ میں رہتے ہیں۔ جسے لوگ اب زمرہ حویلی کے نام سے پکارتے ہیں۔ دونوں بیٹے اپنی سوتیلی ماں سے کچھ زیادہ سروکار نہیں رکھتے اور ان دونوں کے اپنے مشاغل ہیں۔ گھر میں ان سب کے علاوہ نواب کے بڑے بھائی کی بیوہ نواب خاتون بھی رہتی ہیں لیکن ان کا گزر حویلی کے پچھلے حصے میں ہی زیادہ رہتا ہے اور وہ شوہر کی موت کے بعد زیادہ لوگوں سے گھٹتی لمبی نہیں ہیں۔ پاشا صاحب بھی اپنے دوست کے اصرار پر اپنا زیادہ وقت زمرہ حویلی کے مہمان خانے میں ہی گزارتے ہیں، لیکن گزشتہ مہینے سے حویلی میں کچھ پراسرار واقعات کی وجہ سے نواب صاحب کا چین غارت ہو گیا ہے۔ پہلے ان کی خواب گاہ میں کہیں سے کوئی سانپ گھس آیا جب کہ اس علاقے میں سانپ بسیرا نہیں کرتے۔ پھر ان کی رولز راکس کار کی بالکل ٹھیک ٹھاک بریکیں عین سفر کے دوران جواب دے گئیں۔ ڈرائیور اگر عین وقت پر اپنے حواس درست نہ رکھتا تو بڑا حادثہ ہو سکتا تھا۔ پھر نواب صاحب کے چھت کی بالکنی سے ایک وزنی گملہ ٹھیک اسی وقت نیچے گر گیا جب نواب صاحب کی چہل قدمی کا وقت تھا۔ ایک آدھ بار کھانے میں بھی کچھ زہریلی چیز کی آمیزش پائی گئی لیکن محتاط ہونے کی وجہ سے پہلے ہی لقمے کے بعد نواب صاحب نے سب کو کھانا کھانے سے روک دیا۔ غرض ہر واقعہ پہلے حادثے سے زیادہ گھمبیر اور منصوبہ پہلے سے زیادہ پختہ محسوس ہوتا تھا۔ نواب صاحب اسی بارے میں سارنگا کی مدد کے طالب تھے۔

سارنگانے ساری بات سن کر لمبی سی ہونہ کی ”تو پھر آپ کے ساتھ اپنا کوئی حرام خورگاہ دیویں..... جو آپ کی حفاظت کرے.....“



”جی محافظ تو پہلے بھی کچھ ہیں برائے نام گھر میں..... لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں بات کی تہہ تک پہنچ کر اس دشمن کو رگے ہاتھوں پکڑ سکوں..... وہ جو کوئی بھی ہے حویلی کے اندر ہی کا ہے..... لہذا گھر کی بات باہر نکلنے کا بھی ڈر ہے مجھے..... کوئی ایسا طریقہ ہو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے.....“

رنگا گہری سوچ میں گم ہو گیا، اور پھر کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ ”ٹھیک ہے نواب صاحب..... آپ میرے کو کچھ وقت دے دو..... تب تک آپ کی کوششی کے باہر ہم اپنا سپرہ ڈال دیں گے..... کچھ بات سمجھ میں آئی تو آپ سے رابطہ کریں گے..... رب بھلی کرے گا.....“

پاشا اور نواب دیر شکر یہ ادا کر کے جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جاتے جاتے نواب نے بتایا کہ اس نے اپنی یہاں آمد کو بے حد خفیہ رکھا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا دشمن ہوشیار ہو جائے۔ موسیٰ نے بریکیل تذکرہ نواب صاحب سے پوچھ لیا کہ کہیں مستقبل قریب میں اس کا سیاست وغیرہ میں حصہ لینے کا کوئی ارادہ تو نہیں۔ نواب دیر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ہاں..... مگر آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ موسیٰ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا پیسہ اور اس کا اقتدار ہوتا ہے۔ آپ جدی پشتی نواب ہو لہذا پیسہ اپنی دشمنی آپ کے پرکھوں سے نکال چکا ہوگا۔ اب تو صرف کوئی ذاتی دشمنی یا اقتدار کی دشمنی ہی باقی رہ جاتی ہے۔ اس لیے آج رات جب آپ سونے کو جاؤ تو بستر پر لیٹ کر اپنے ذاتی دشمنوں کی فہرست بھی بنا لیتا۔ ہو سکتا ہے کوئی آپ سے پرانی دشمنی کا حساب چکار ہا ہو۔ ویسے دھیان رہے کہ آپ کا محل ہمارے علاقے سے باہر ہے.....“

نواب نے سر ہلایا۔ ”میں اس جانب بھی پورا اطمینان کر چکا ہوں مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میری کسی سے کوئی ذاتی پر خاش ہو، بہر حال آپ کہتے ہیں تو آج دوبارہ سوچتا ہوں۔“ پاشا اور نواب ہم سب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ میں اس رات اپنے بستر پر لیٹا یہ سوچتا رہا کہ یہاں ہر دیوار کے پیچھے ایک نئی کہانی بنتی اور ایک نیا فسانہ جڑتا ہے لیکن بظاہر دیکھنے میں یہ سب درود دیوار، یہ محل یہ مکان اور یہ شہر اوپر سے کتنا پرسکون لگتا ہے۔

اگلی صبح پھر سے رنگا کی سرکار کا دفتر لگا اور دو پہر تک لوگوں کے مسائل کا انبار سمیٹا جاتا رہا۔ سہ پہر کی چائے کے بعد اسماعیل نے ناہید کی طرف جانے کے لیے گاڑی تیار کر لی۔ میرا ارادہ تھا کہ آج میں شیخ صاحب اور ستارہ کو بھی ناہید کی طرف لے جاؤں گا تاکہ ان کے ذہن اور دل سے گھجک دور ہو سکے.....

اسماعیل نے گاڑی مرکزی گیٹ سے باہر نکالی تو دربان کو کسی سے بحث کرتے پایا۔ وہ زور زور سے کسی کو اندر جانے سے منع کر رہا تھا کہ رنگا بھائی سے اجازت لیے بغیر وہ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں نے بے خیالی میں گیٹ کے باہر کھڑے افراد پر نظر ڈالی اور پھر میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”گاڑی روکو.....“

اسماعیل نے گھبرا کر جلدی سے بریک لگائی۔ گیٹ کے باہر ابا اور ریحان کھڑے ہوئے تھے۔ میں تیزی سے گاڑی سے اترا۔ اپنے خیالوں میں گم کھڑے ابا کی نظر مجھ پر پڑی۔



## باب 15

ابا کی آنکھوں میں حیرت اور دکھ کی ایک لہریں ابھری جس نے پل بھر میں ہی شدید غصے اور قہر کے طوفان میں جذب ہو کر ان کے اندر اٹھتے طوفانوں کی خبر دے دی۔ وہ بولے تو ان کی آواز اس پاس لوگوں کی وجہ سے دھیمی تھی مگر ان کے لہجے میں چھپا آتش فشاں میں خوب جانتا تھا۔

”خوب..... جب اے ایس پی بلال نے مجھے بتایا کہ میرا سپوت باقاعدہ غنڈہ بن گیا ہے تو میرے اندر رشک کی ایک ہلکی سی دھج باقی تھی کہ شاید میرا خون ابھی اتنا سفید نہ ہوا ہو لیکن آج یہ آخری بھرم بھی توڑ دیتا تم نے..... آ یاں تم اس حد تک چلے جاؤ گے..... یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا.....“ اسماعیل پریشانی سے باپ بیٹے کے درمیان گہری ہوتی اس غلیج کو دیکھ رہا تھا۔ میں چپ رہا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اے ایس پی واپس جا کر اتنی جلدی ابا کو یہ خبر پہنچا دے گا۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی مناسب موقع پر پہلے ریحان کو یہ بات بتاؤں گا تا کہ ایسی کسی صورت حال میں وہ بات بگڑنے سے بچا سکے، لیکن کہتے ہیں کہ تقدیر ہمیشہ تدبیر سے دو قدم آگے چلتی ہے۔

ریحان خاموش کھڑا رہا کیونکہ اس کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اس نے ابا کو سنبھالنے کی کوشش کی ”آپ کی طبیعت پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں ہے ابا..... آپ خود پر مزید بوجھ نہ ڈالیں۔ میں آ یاں سے بات کر لوں گا۔“ ابا کی آواز اب بھی کانپ رہی تھی..... ”نہیں..... یہ سب جانتا ہے۔ یہ صرف مجھے آزار پہنچانے کے لیے یہ سب کرتا ہے۔ ریحان مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ آج سے میرا صرف ایک ہی بیٹا ہے۔ چلو یہاں سے.....“ ابا تیزی سے پلٹے اور چل دیے۔ ریحان نے بے بسی سے میری جانب دیکھا اور تیزی سے لڑکھڑاتے ابا کو سہارا دے کر قریب سے گزرتے ایک رکشہ کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ ریحان ابا کو لے کر وہاں سے چلا گیا اور میں وہیں گیٹ کے سامنے لٹا پٹا سا کھڑا رہ گیا۔ اسماعیل نے مجھے بہت سنبھالنے کی کوشش کی لیکن میرے دو بے تاب اور بہت دیر سے رکے آنسو میری آنکھوں سے چھلک ہی پڑے۔ ٹھیک اسی لمحے سارنگا کی وین گیٹ سے باہر نکلی اور شاید سارنگا نے مجھے روتے اور اسماعیل کو مجھے سنبھالتے دیکھ لیا۔ وہ ہڑبڑایا سا گاڑی سے باہر نکل کر میری جانب لپکا۔ تب تک میں اپنی آنکھوں کو زور سے مسل چکا تھا ”کیا ہوا شہزادے..... سب خیر تو ہے نا.....“ مجھ سے کچھ بولا نہیں گیا لیکن اسماعیل نے اسے ابا کی آمد سے لے کر واپسی تک کا سارا قصہ مختصر آ یاں کر دیا۔ سارنگا کچھ بے چین سا ہو گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک جانب لے گیا ”تیرا من تو اندر سے بڑا کول ہے ساجن..... پر یاد رکھ..... یہ دنیا رونے والے کے ساتھ نہیں، بلکہ دلانے والے کے ساتھ ہوتی ہے۔ تو کہے تو ہم ابھی تیرے باوا کے گھر چلے ہیں۔ میں خود پیر پکڑ لوں گا ان کے..... پر تو خود کو یوں نڈھال نہ کر..... رنگا سے دیکھا نہیں جانے گا.....“

میں نے رنگا کو تسلی دی کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ابا کی حالت دیکھ کر من بھر آیا تھا۔ مجھے ان کی ڈانٹ کا کوئی ملال نہیں ہے۔ سارنگا کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں کچھ کم ہوئیں تو اسے وہ ضروری کام یاد آیا جس کے لیے وہ گھر سے نکل رہا تھا لیکن آج خلاف معمول موسیٰ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ رنگا کے جانے کے بعد میں بھی اسماعیل کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسماعیل نے گاڑی سٹارٹ کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا ”تم

کہو تو آج کی پڑھائی رہنے دیتے ہیں۔ میں ناہید بیٹا کو جا کر پیغام دے آؤں گا۔ تم آج گھر پر ہی آرام کر لو۔“

”نہیں..... میں ٹھیک ہوں..... یہاں تنہائی میں پڑا رہا تو ضرور کچھ ہو جائے گا مجھے۔ تم شیخ صاحب کے ہاں چلو..... آج انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے ہم نے.....“

ہم سادات محلے پہنچے تو پھر سے گلی میں موجود لوگوں کی نظریں اس بڑی گاڑی پر جم گئیں انسان ہمیشہ سے اپنے معمول کا کس قدر پابند رہا ہے کہ کوئی بھی غیر معمولی رویہ اس کے ماحول کی تمام جزئیات بدل کر اسے چونکنے پر مجبور کر ہی دیتا ہے۔ شاید ہم سب اپنے اپنے معمول کے غلام ہوتے ہیں۔

آج شیخ صاحب نے اسماعیل کو بھی اندر بیٹھک میں ہی بلا لیا مگر وہ ابھی تک کسی شدید الجھن کا شکار نظر آرہے تھے۔ ایک طرف ان کی لاڈلی مگر غم زدہ بیوہ بیٹی کی فرمائش تھی تو دوسری جانب ان کے اپنے خدشات، کاش ناہید کو یہاں لانے میں اتنی مشکلات درپیش نہ ہوتیں تو میں خود اسے اپنی نگرانی میں روزانہ یہاں لے کر آجایا کرتا..... کچھ ہی دیر میں اندر سے چائے کے لوازمات آگئے تو شیخ صاحب نے مجھ سے کہا ”آیان بیٹا..... شیخانی جی تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔ تم میرے ساتھ چل کر ذرا ان کی بات سن لو۔“ میں کچھ حیرت زدہ سا ان کے ساتھ چل پڑا۔ اسماعیل سے انہوں نے دو گھڑی کے لیے معذرت چاہی کہ بس ابھی دوبارہ حاضر ہوتے ہیں۔ میرا دل پھر سے اپنی پوری قوت کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا۔ جانے یہ اچانک بیٹھے بیٹھے اس دل کو کیا ہو جاتا تھا۔ میں آج پہلی بار شیخ صاحب کے ساتھ بیٹھک سے ملحق درمیانی کمرے میں آیا تھا جس کے دروازے کے پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر ستارہ اور گہنا مجھ سے بات کیا کرتی تھیں۔ سادہ سا فرنیچر کتابوں کے چندریک اور ان سے جڑی میز کرسی یہ بتا رہی تھی کہ یہ تصویر کے پڑھنے کا کمرہ تھا۔ شاید گہنا بھی یہیں بیٹھ کر پڑھتی ہوگی کمرے کے وسط میں بید کی لکڑی سے بنی چند ہلکی پھلکی کرسیاں اور میز بھی پڑی تھی۔ شیخ صاحب نے مجھے وہاں بیٹھنے کا اشارہ کر کے باہر کی جانب آواز لگائی۔ ”ابھی سنتی ہیں..... آیان میاں آئے ہیں.....“ باہر سے شیخانی جی اور ستارہ اندر کمرے میں آگئے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر سلام کیا اور دعائی۔ شیخ صاحب نے مجھ سے کہا ”انومیاں..... تم ان کی بات سنو..... میں اسماعیل صاحب کے پاس بیٹھتا ہوں۔ وہ تنہا بیٹھے ہیں وہاں.....“ شیخ صاحب کے جانے کے بعد میں نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ستارہ کچھ الجھی سی تھی ”دراصل ابانے مجھے اجازت تو دے دی ہے لیکن وہ اندر سے بہت پریشان ہیں۔ خاص طور پر اس گھرانے کے بارے میں جان کر۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات پر بھی شرمندہ ہیں کہ میری خاطر آپ نے اتنا کچھ کیا مگر اب اگر میں نے انکار کر دیا تو آپ کی کتنی دل آزاری ہوگی۔ انہوں نے برسبیل تذکرہ ٹیلی فون پر حمید بھائی سے بھی ان کی رائے کی تھی کل شام وہ خاص طور پر ڈاک خانے گئے تھے سرکاری فون پر بات کرنے مگر حمید بھائی نے بھی انہیں سختی سے منع کر دیا تھا۔“ ستارہ کی پیشانی پر پسینے کے چند ننھے موتی سے جھلکانے لگے تھے، صاف لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے کتنی شدید کش مکش کا شکار ہے۔ میں نے اس کی الجھن دور کرنے کی کوشش کی ”ٹھیک ہے..... اس میں ایسی پریشانی والی بھی کوئی بات نہیں..... اگر وہ مناسب نہیں سمجھتے تو آپ کو انہی کی بات ماننا چاہئے.....“ اتنے میں برآمدے سے آواز آئی ”پریشانی ہی کی تو بات ہے آیان صاحب..... آپ کو بھی تو ذرا ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا ہے..... اب ہم بے چارے تو آپ کے غصے سے بھی ڈرتے ہیں ناں.....“ وہ شریسی آواز



گہنا کی ہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ اندر آچکی تھی۔ شیخانی جی نے اسے گھورا ”گہنا..... کتنی بار کہا ہے تم سے کہ بڑوں کی باتوں میں نہیں بولا کرتے“ وہ گلابی کرتے اور سفید دوپٹے میں کوئی پری محسوس ہو رہی تھی۔ جانے یہ اس کے عارض کا گلاب تھا جو اس کے کرتے کو گلابی کر رہا تھا یا پھر اس کی پوشاک کا گلابی پن تھا جس نے اس کے چہرے پر گلاب نکھیر رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی سلام کر کے اپنی ماں کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے میں اپنے سارے لفظ، اپنی پوری لغت ہی بھلا بیٹھا..... پھر زبردستی بات جوڑنے کی خاطر میں نے کچھ بے ربط سے لفظ منہ سے نکالے ”نہیں نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں..... جیسا آپ سب کو مناسب لگے وہی ٹھیک ہوگا.....“ مگر ستارہ اب بھی پریشان تھی..... ”لیکن آپ نے تو ان لوگوں سے ساری بات بھی طے کر لی ہے۔ وہ لوگ برامان جائیں گے۔“

”ان کی آپ فکر نہ کریں۔ ناہید میری چھوٹی بہن جیسی ہے۔ اسے اپنے بھائی کی کوئی بات بری نہیں لگ سکتی..... آپ دل پر کوئی بوجھ نہ رکھیں.....“ گہنا پھر بول پڑی ”ارے..... چھوٹی بہن سے یاد آیا۔ ہم کل محلے کی تیسری گلی میں کسی تقریب میں گئے تھے۔ وہاں ہماری ملاقات رانہ سے ہوئی تھی.....“ مجھے خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ ”واقعی.....؟..... کمال..... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے..... کیسی تھی وہ..... اور آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ رانہ ہے.....؟“ میں جوش میں بیک وقت کئی سوال کر گیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے خود ہی اپنا راز کھول دیا ہے۔ شیخانی جی نے مجھ سے گلہ کیا ”آیاں بیٹا تم نے گھر چھوڑ دیا اور ہمیں بتایا بھی نہیں..... وہ تو کل جب تمہاری بہن سے ستارہ اور گہنا کی ملاقات ہوئی اور سارا واقعہ کھلا تو ہمیں پتہ چلا.....؟“

شاید شیخ صاحب نے ابھی تک گھر میں ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے شیخانی جی کو بتایا کہ میں نے شیخ صاحب سے ذکر کیا تھا۔ ستارہ کی آواز میں بھی گلہ تھا ”آپ نے اپنے گھر والوں کو پوری بات کیوں نہیں بتائی تھی کہ آپ ابا کو پچاتے ہوئے اس جھگڑے میں ملوث ہو گئے تھے، بلکہ آپ کو چاہئے تھا کہ اپنے ابا کو ہمارے ہاں لے آتے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیتے اور ہمارے ابا سے مل کر ان کی ناراضگی بھی ختم ہو جاتی، لیکن آپ نے یہ سب اپنے گھر والوں کو نہ بتا کر اچھا نہیں کیا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اور یہ سب کچھ ہمارے خاندان کی وجہ سے ہوا۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کی ”نہیں نہیں..... سچ تو یہ ہے کہ ہم پہلے سے ہی ان لڑکوں کو اپنے علاقے میں غنڈہ گردی کرنے سے روکنا چاہتے تھے۔ شیخ صاحب کا قصہ درمیان میں نہ بھی آتا تو یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ ان کی وجہ سے کوئی بات نہیں بگڑی.....“ گہنا نے براہ راست مجھ سے پوچھا ”لیکن آپ کو یہ سب کچھ برا نہیں لگتا..... میرا مطلب ہے ایسے گھٹیا غنڈوں اور اچکوں کے لیے قانون موجود ہے۔ آپ نے ان سب کو قانون کے حوالے کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ سچ بتاؤں تو مجھے یہ غنڈہ گردی اور یہ سب ہنگامے بہت برے لگتے ہیں..... ہمیں ان کی وجہ سے ان جیسا تو نہیں بن جانا چاہئے نا..... کل تقریب میں بھی سب لوگ آپ اور آپ کے دوستوں کے بارے میں بات کر رہے تھے..... سنیں..... آپ یہاں وہاں بھٹکنے کے بجائے ایس ایس کیوں نہیں کر لیتے.....؟.....“

میں نے حیرت سے اس نازک اندام کی طرف دیکھا جو آج پہلی مرتبہ مجھ سے اتنا کھل کر بات کر رہی تھی ”کیوں.....؟..... کیا میرے ہی ایس ایس کرنے سے ملک کے تمام معاملات سدھر جائیں گے.....“ میرے جواب پر ستارہ اور شیخانی جی مسکرائیں..... گہنا نے ضد کی ”بتائیں نا..... آپ مقابلے کے امتحان میں کیوں نہیں بیٹھ جاتے.....“

”کیونکہ میری طبیعت کسی بھی سرکاری نوکری کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ مجھے یہ افسری بھی بڑی غلامی لگتی ہے۔“ گہنا حیران ہوئی ”اچھا۔ حیرت ہے۔؟“ بھی مجھے تو یہی ایس پی افسران بڑے کمال لگتے ہیں۔ سوٹ بوٹ، ٹانگی شائی، نکھرے نکھرے سے، سب پر حکم چلاتے ہوئے افسر۔۔۔۔۔ ویسٹ کوٹ میں تو اور بھی شاندار نظر آتے ہیں اور اگر وردی میں ہوں تو پھر تو کیا ہی بات ہے۔۔۔۔۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ میں بھی مقابلے کا امتحان پاس کر کے ایس پی ہوں گی پھر آپ اور ستارہ آپنی آنا میرے پاس۔۔۔۔۔ ان سب غنڈوں کی چھٹی نہ کر دی تو گہنا نام نہیں ہے میرا۔۔۔۔۔“

اتنے میں بیشک کی جانب سے شیخ صاحب کے کھانسنے کی آواز سن کر گہنا کی پھول جڑتی زبان کو فوراً ہی جیسے بریک سی لگ گئی۔ ستارہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شیخ صاحب اندر داخل ہوئے۔ ”ہاں بھئی۔۔۔۔۔ کیا فیصلہ ہوا۔۔۔۔۔“ میں نے انہیں اطمینان دلایا۔ ”آپ نے خود کو اتنے جو حکم میں کیوں ڈالے رکھا۔۔۔۔۔ آپ مجھے خود مع کر دیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ بہر حال اب اس قصے کو ختم کیجئے۔ آپ کے اطمینان میں ہی ہم سب کا اطمینان ہے۔“ شیخ صاحب نے گہری سانس لی ”سچ تو یہ ہے آیان میاں کہ ستارہ مجھ سے کہیں زیادہ پریشان تھی کیونکہ تم نے واقعی سچے دل سے اس کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔“ میں نے بات ٹالنے کے لیے ادھر ادھر کی چند باتیں کیں اور شیخ صاحب سے اجازت چاہی کہ ناہید ہمارا انتظار کرتی ہوگی لہذا اب مجھے چلنا چاہئے۔ اچانک شیخ صاحب کے ذہن میں کوئی بات آئی ”آیان میاں۔۔۔۔۔ اگر تم مناسب سمجھو تو آج میں اور ستارہ خود تمہارے ساتھ چل کر ناہید بٹیا کو اپنی مجبوری سے آگاہ کر آئیں میں جانتا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں مگر ہم دونوں کے دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو جائے گا کہ ہماری وجہ سے تمہیں اس شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“ میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے ہامی بھری ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ جیسے آپ کی مرضی۔ ناہید بہت مختلف لڑکی ہے، لیکن اگر آپ کا دل ہلکا ہوتا ہے تو آپ دونوں ضرور چلیے اسی بہانے ناہید کو بھی ایک نئی سہیلی سے ملاقات کا موقع مل جائے گا۔“

ستارہ کے چہرے پر بھی شیخ صاحب کی یہ تجویز سن کر روشنی آ گئی۔ کچھ ہی دیر میں ہم گھر سے نکلنے لگے تو گہنا نے اپنی اماں کے عقب سے حسب معمول شرارت کی ”آپ نے ستارہ آپنی کی تو بڑے جی جان سے مدد کر دی لیکن اگر کبھی مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوئی تو مکر تو نہیں جائیں گے۔۔۔۔۔؟“ شیخ صاحب اندر شیروانی بدلنے گئے ہوئے تھے میں نے اسے اطمینان دلایا ”چلیں آج آپ کی امی کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جب کبھی آپ کو ضرورت ہوئی۔۔۔۔۔ میں اتنی ہی جی جان سے حاضر رہوں گا۔“ شیخانی جی اور ستارہ نے بڑی مشکل سے اسے گھور گھور کر چپ رہنے کے اشارے کئے، اور ہم سب گھر سے نکل پڑے۔ ناہید واقعی بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی، اور ستارہ کو دیکھ کر تو اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی ”آیان بھیا۔۔۔۔۔ اتنی پیاری استاد کو اتنے دن مجھ سے دور کیوں رکھا۔۔۔۔۔“ شیخ صاحب اور میں مردانے کی طرف بڑھ گئے اور بوانے جھٹ پٹ ہمارے لیے چائے کے ساتھ بہت کچھ بھجوا دیا۔ شیخ صاحب حیرت سے حویلی کے دروازے پر کھڑے کھڑے رہے اور اس کی سجاوٹ اور نفاست کی داد دیتے رہے۔ تقریباً گھنٹے بعد ستارہ کی طرف سے واپسی کا پیغام آ گیا۔ ہم مردانے سے نکلے تو بوانا، ناہید اور ستارہ برآمدے میں ہی کھڑی تھیں۔ ستارہ ناہید کو اپنی مجبوری شاید بہت اچھی طرح سمجھا چکی تھی اسی لیے ناہید کے چہرے پر ملال کی کوئی پرچھائی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا ”آیان بھیا۔۔۔۔۔ بوا آرگريٹ۔۔۔۔۔ آپ نے مجھے اتنی اچھی دوست سے ملوایا۔۔۔۔۔ اب یہ دوستی کبھی ختم نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ میں نے ستارہ آپنی سے وعدہ لیا ہے کہ وہ گہنا کو بھی ضرور لے کر آئیں گی کسی دن۔۔۔۔۔“

ناہید نے بڑی محبت سے ستارہ کو رخصت کیا۔ شیخ صاحب نے بڑھ کر ناہید کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ”جیتی رہو“۔ میں اسماعیل کے ساتھ ستارہ اور شیخ صاحب کو ان کے گھر چھوڑنے کے لیے ان کی گلی میں پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی۔ شیخ صاحب نے بہت اصرار کیا کہ ہم بھی کچھ دیر کے لیے اندر چلیں لیکن میں نے معذرت کر دی۔ کبھی کبھی ہمیں دل کے بہت خلاف جا کر بھی دنیا کی ریت رواج نبھانے کے لیے کچھ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔

ستارہ نے اترتے ہوئے دھیرے سے کہا ”آپ کا بہت شکریہ آیا ان..... خدا حافظ“ ہم واپس یعقوب مینشن پہنچے تو سارا گنگا ابھی واپس نہیں لوٹا تھا اور موسیٰ آج تنہا ہی مشق اور زور کی نگرانی کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دور سے ہاتھ بلایا، اور میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ آج نہ جانے میرا دل تنہائی کیوں ڈھونڈ رہا تھا۔ شاید وہ بھی مجھ سے آج ملی ڈھیر ساری خوشی بانٹنا چاہتا تھا۔ آج وہ تمام حجاب بالائے طاق رکھ کر مجھ سے محو گفتگو تھی۔ اس سے بڑی خوشی کی بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور جب ہمیں بہت زیادہ خوشی ملتی ہے تو باقی سب لوگوں سے پہلے ہمارا دل ہم سے اسے بانٹنا چاہتا ہے۔ کیونکہ بھیڑ میں تو ہم دل کی سن ہی نہیں پاتے..... دل سے باتیں تو صرف تنہائی میں ہی ہوتی ہیں۔ سو اس رات میں اور میرا دل بھی بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اگلی صبح میرا وجود بہت ہلکا پھلکا تھا۔ میں نے گہنا سے اپنے دل کی بات کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن کب اور کیسے.....؟..... بس یہی طے ہونا باقی رہ گیا تھا۔ دل کے راز بہت عرصہ دل میں رہیں تو ناسور بننے لگتے ہیں، اور میں نے ایسے کسی بھی ناسور کو دل میں نہ پالنے کا عہد کر لیا تھا۔

صبح ساڑھے دس بجے کے قریب اسماعیل نے مجھے بتایا کہ میرا بڑا بھائی مجھ سے ملنے کے لیے گیٹ پر آیا ہے مگر اندر آنے سے ہچکچا رہا ہے۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ”ریحان..... یہاں..... خدا خیر کرے۔“ میں تقریباً دوڑتا ہوا باہر احاطے میں نکلا۔ تب تک موسیٰ ضد کر کے ریحان کو اندر باغیچے میں لا کر سامنے پڑے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھا چکا تھا۔ میں تیزی سے ریحان کی جانب لپکا ”تم..... یہاں..... سب ٹھیک تو ہے نا.....“ ”ہاں..... سب ٹھیک ہے..... لیکن تم سب ٹھیک رہنے کب دیتے ہو..... ابا کی طبیعت تمہاری وجہ سے کل شدید بگڑ گئی تھی..... رات بھر ہم سب ان کے سر ہانے کھڑے رہے..... صبح نماز کے بعد کچھ آرام آیا تو سوئے ہیں..... ڈاکٹر بھی آیا تھا..... کہہ رہا تھا کہ ہائی بلڈ پریشر ہے.....“ میں نے ریحان سے شکوہ کیا..... ”تمہیں ابا کو یہاں نہیں لانا چاہئے تھا.....“ ”میرے روکنے سے وہ بھلا کب رکنے والے تھے۔ میں ساتھ نہ بھی آتا تو وہ خود چلے آتے..... اے ایس پی نے خبر ہی ایسی دی تھی کہ ہم سب کے تو حواس ہی معطل ہو گئے تھے..... تم چلو یہاں سے..... میں نے یونیورسٹی کے ہاسٹل میں ایک دوست سے کمرہ لے لیا ہے چند دنوں کے لیے..... جب تک ابا کا غصہ اتر نہیں جاتا..... تم وہیں رہ لینا.....“ ”نہیں..... میں اب کہیں نہیں جاؤں گا..... اور یہ تم سب نے اس جگہ کا اس قدر ہوا کیوں کھڑا کر رکھا ہے۔ یہاں بھی انسان بستے ہیں اور وہ بھی ہماری طرح اچھے یا برے ہیں۔“

ریحان نے غور سے میری جانب دیکھا ”ہاں..... وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں کہ تم پر یہ جگہ کتنی اثر انداز ہو رہی ہے۔ تم سیدھی طرح چلتے ہو یا میں تمہیں زبردستی کھینچ کر لے جاؤں.....“ میں نے دکھ سے اپنے معصوم بھائی کی طرف دیکھا..... وہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی کبھی وقت ہمیں کچھ اس طرح



سے زمین میں گاڑ دیتا ہے کہ پھر کوئی بندھن ہمیں اپنی جگہ سے ہلانہیں پاتا۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا ”ٹھیک ہے چلا جاؤں گا، مگر ان لوگوں کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔۔۔۔۔ میں یوں منہ اٹھا کر تو نہیں چل سکتا ناں۔۔۔۔۔ کچھ وقت دو مجھے۔۔۔۔۔“ ریحان کے چہرے پر سکون کے آثار پیدا ہوئے۔۔۔۔۔ ”اچھا ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ مگر جلدی کرنا۔ ویسے مجھے بالے اور رجبہ نے ان کے بارے میں کافی کچھ بتا دیا ہے لیکن پھر بھی ہماری اور ان کی دنیا بہت الگ ہے۔ ہاں تم چاہو تو اس لڑکی کو ٹیوشن پڑھاتے رہنا۔۔۔۔۔“

میں خاموشی سے ریحان کو دیکھتا رہا۔ خدا کسی کو اتنا بھولا بھالا اور سیدھا بھائی بھی نہ دے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ جو بات میں کہنا سے پوچھنا چاہتا تھا اب وہ بات رافضہ بھی تو پوچھ سکتی تھی۔ وہ کہنا سے مل چکی تھی اور ضرور اس نے حسب عادت اسے اپنی ”سب سے گہری سبیلی بھی بتا لیا ہوگا۔ میں نے ریحان کو چند منٹ انتظار کرنے کا کہا اور جلدی سے ایک کاغذ پر ساری تفصیل لکھ کر رافضہ کو سختی سے تاکید کی کہ وہ ریحان کے ہاتھ ہی جلد از جلد جواب بھیجوا دے۔

میں نے خط ریحان کے حوالے کیا کہ وہ اسے چھوٹی کو دے آئے اور جیسے ہی وہ جواب دے فوراً مجھ تک واپس پہنچا دے۔ ریحان کو میرے اور چھوٹی کے یہ جاسوسی رابطے ہمیشہ سے بہت برے لگتے تھے مگر آج اس نے بنا چوں چرا کیے خط لے لیا، اور چلا گیا، لیکن میں انتظار کی سولی پر منگا رہا، اور پھر ٹھیک تیسرے دن مجھے اسماعیل نے ایک لفافہ لا کر دیا ”صبح سویرے تمہارا بھائی گیٹ پر دے گیا تھا۔ تم سو رہے تھے اس وقت۔۔۔۔۔“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ پکڑا۔ اس پر چھوٹی کے ہاتھ کی لکھائی نظر آرہی تھی۔



## حاصل

**حاصل** آپ کی پسندیدہ مصنفہ عمیرہ احمد کے حساس قلم کی تخلیق ہے۔ یہ ناول عمیرہ احمد کے ابتدائی دور کی یادگار تحریر ہے۔ بعد میں انہوں نے اسی طرز پر اپنا ایک اور ناول ”لا حاصل“ بھی تحریر کیا تھا جو کہ بہت پسند کیا گیا۔ حاصل کہانی ہے ایک نوجوان کی جو سچے مذہب اور دینی سکون کی تلاش میں ہے اور اپنی اس تلاش میں وہ مسلمان سے عیسائی مذہب اختیار کرنا چاہتا ہے اور یہ کہانی ہے ایک نوجوان لڑکی جسے متلاشی ہے آفاقی مذہب کی اور دلی سکون کی اور اُس کی یہ تلاش اُسے عیسائیت سے متنفر کر کے اسلام کی راہ پر لے آتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ عمیرہ احمد کے مداح اس ناول کو پسند کرے گے۔ ”حاصل“ کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے **ناول** سیکشن کے معاشرتی رومانی ناول میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## باب 16

میری حالت اس وقت اس پیامبر جیسی تھی جو اپنے محبوب کو خط روانہ تو کر دیتا ہے مگر پھر سارا وقت یہی سوچ سوچ کر خود کو ہی نوچتا رہتا ہے کہ کاش وہ یہ سندرہ نہ ہی بھیجتا تو اچھا تھا۔ خود ہی دل کی بات چٹھی میں لکھ بھیجتا ہے اور پھر خود ہی پشیمان ہوتا ہے کہ کاش وہ ڈاکے کو روک لیتا۔ تو بہتر ہوتا کہ کہیں اس کا محبوب اس کے کسی لفظ سے، کسی شکوے سے آزرده نہ ہو جائے۔ لفظ لکھے ہوں تو سب کچھ بول نہیں پاتے..... کاش وہ خود ہی جا کر اپنا مدعا بیان کرتا تو یہ ملال تو نہ رہتا۔

میں بھی رافعہ کا خط ملنے تک اسی شش و پنج کا شکار رہا۔ جانے چھوٹی میری بات ٹھیک طرح سے کہنا تک پہنچا بھی سکے گی یا نہیں..... کہیں کہنا کسی بات کا کوئی غلط مطلب نہ لے لے..... مجھے خود جا کر اس سے بات کرنی چاہئے تھی..... اس جلد بازی کا انجام کہیں برانہ ہو۔ غرض ایسی ہزار سوچوں کے تیر میرا وجود تین دن تک چھلنی کرتے رہے اور جب خدا خدا کر کے تین دن بعد مجھے میری سوچوں کا جواب ملا تو میں گھنٹوں چھوٹی کا خط لیے بیٹھا اسے کھولنے سے ڈرتا رہا جیسے وہ خط نہ ہو، کسی سپیرے کی پٹاری ہو۔ جسے کھولتے ہی کوئی ناگ مجھے ڈس لے گا۔ پھر بہت دیر بعد جب میں نے وہ خط کھولا تو اس میں لکھی حقیقت کا زہر کسی زہریلی ناگن کے زہر سے زیادہ تیزی کے ساتھ میری نسوں میں پھیلتا گیا۔

میں نے اپنے خط میں چھوٹی کو لکھا تھا کہ وہ کسی طرح کہنا سے میرے بارے میں اس کی رائے پوچھ کر مجھے بتائے۔ رافعہ نے خط کے شروع میں تو مجھ سے حسب معمول خوب جھگڑا کیا تھا کہ میں اگر فوراً سب کچھ چھوڑ چھا ڈکر گھر واپس نہ لوں تو وہ مجھ سے پھر کبھی نہیں بولے گی، اور مجھے کسی بڑی آپنی کی طرح بہت سی نصیحتیں لکھ بھیجی تھیں کہ بڑے تو چھوٹوں پر اپنا غصہ نکالنے ہی رہتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ چھوٹے روٹھ کر ہی بیٹھ جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن مجھے جن لفظوں کا شدت سے انتظار تھا وہ آخری صفحے پر چپکے مگر میری تقدیر کا ستارہ سدا کے لیے بجھا گئے۔ حالانکہ چھوٹی نے میری دل آزاری کو دھیان میں رکھتے ہوئے بہت مناسب الفاظ کا استعمال کیا تھا مگر خیر کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اور اس کی دھار شکار کی اذیت کم کرنے کے لیے کتنی بھی تیز کیوں نہ کر لی جائے..... اس کا وار ہمیشہ نازک ریشوں کو چیر کر جسم کے آر پار ہو جاتا ہے۔ ٹھیک میرے ساتھ بھی ویسا ہی ہوا۔

رافعہ کی تحریر پر میری نظریں پھسلتی گئیں۔ انو بیامیری پہلے دن بھی کہنا سے آپ کے بارے میں بہت تفصیل کے ساتھ بات ہوئی تھی مگر آپ کے کہنے پر اب اسے بہانہ کر کے میں خاص طور پر سادات محلے ان کے گھر گئی۔ ماشا اللہ بڑی تہذیب اور رکھ رکھاؤ والے لوگ ہیں۔ کہنا کی اماں تو بھی بھیجی جاتی تھیں۔ ستارہ آپنی بھی کہنا ہی کی طرح بہت پیار کرنے والی ہیں۔ مجھے وہاں دیکھ کر وہ سبھی بہت خوش ہوئے۔ بڑی مشکل سے مجھے کہنا سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ مگر بھائی..... وہ کچھ اور خیالات کی لڑکی ہے۔ اس کے سپنوں کا شہزادہ کوئی غریب معمولی لڑکا نہیں بلکہ کوئی سی ایس پی آفیسر ہے۔ میں نے طریقے سے اس سے پوچھا کہ آپ کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے تو جھٹ سے بولی کہ ایسے مخلص انسان اس دور

میں شاید کچھ ہی بچے ہوں مگر اسے آپ کے رہن بہن اور معروفتوں سے بہت اختلاف تھا۔ کہنے لگی کہ آپ کو ان غنڈے بد معاشوں کا پیچھا چھوڑ کر اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہئے۔ پھر میں نے کسی اور طریقے سے بات بدل کر اس سے اس کے مستقبل اور شادی وغیرہ کے بارے میں بات کی تو گہنا ہنستے ہوئے بولی کہ اس نے تو پہلے ہی اپنی اماں اور آپ کو خبردار کر رکھا ہے کہ کسی سی ایس پی افسر کے علاوہ کہیں ہاں نہ کریں۔

آیاں بھائی جانے مجھے اس کی باتوں سے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ وہ آپ کی دل چسپی ستارہ آپلی میں سمجھتی ہے اور شاید اسی رشتے سے وہ آپ سے چھیڑ خانی بھی کرتی رہتی ہے اور ستارہ آپلی..... وہ تو آپ کی اتنی منمن ہیں کہ بس کیا بتاؤں۔ جتنی دیر میں وہاں رہی، وہ آپ کے ہی گن گاتی رہیں اگر آپ نے خود مجھے گہنا کی مرضی معلوم نہ کرنے کا کہا ہوتا تو میں بھی ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتی۔ بہر حال میرے پیارے اور معصوم سے بھیا..... آپ گہنا کا خیال دل سے نکال دیں کیونکہ اس کے خوابوں کی تعبیر کچھ اور ہے.....

چھوٹی نے اس کے بعد بھی کچھ لکھا تھا لیکن میری آنکھوں کی ضیاء تو اتنا ہی پڑھ کر محسوس ہو چکی تھی۔ خط کے صفحے میرے ہاتھوں سے پھسل کر گرے اور کھڑکی سے اندر آتی تیز ہوا کے ساتھ کمرے میں یہاں وہاں بکھر گئے۔ بالکل اس طرح جیسے میرے خزاں رسیدہ دل کی شاخوں کے سوکھے پتے اس وقت میرے وجود کے اندر بکھرے پڑے تھے۔

تو گویا گہنا بھی مجھے ایک غنڈے اور بد معاش سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ ایک ایسا غنڈہ جو ان جانے میں اس کے گھر والوں کی کچھ مدد کر گیا تھا۔ مگر بڑے تو سدا بڑے ہی ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کچھ پل کے لیے کسی کی مدد ہی کیوں نہ کر جائیں۔ میرے اندر بیک وقت بہت سے چھناکے ہوئے۔ کون کہتا ہے کہ دل ٹوٹنے کی آواز نہیں آتی۔ کاش کوئی اس وقت میرے قریب ہوتا تو اسے میرے روئیں روئیں سے یہ چیخ و پکار سنائی دے جاتی میں اس کے تکلف کو بھی اخلاص سمجھتا رہا جب کہ وہ تو کبھی میرے دل کی شناسا ہی نہ تھی اور پھر اس روز اس نے کھلے لفظوں میں اپنی پسندنا پسند بھی تو سب کے سامنے مجھے بتا دی تھی۔ شاید وہ یہ سب مجھی کو سنانا چاہتی تھی۔ میں پھر بھی کیوں نہ سمجھ پایا؟ اور پھر جی ہی تو ہے۔ گلیوں بازاروں میں بھٹکتے ایک آوارہ کو کون اچھا سمجھے گا۔ جسے خود اس کے اپنے بھی دھکار چکے ہوں اسے گھر بدر کر دیا گیا ہو، اور زمانے بھر کے اصرام اور بدنامی اس کے ماتھے کا ٹیکہ ہوں۔ ایسے بے گھر بنجارے کو کوئی نازنین اپنے دل کا محرم بھلا کیوں بنائے گی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور جھماکا ہوا۔ اس روز گھر سے رخصت ہوتے وقت تنویر نے گلی میں مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی سی ایس پی کی تیاری کر رہا ہے۔ اوہ..... اس کا مطلب وہ بھی گہنا ہی کی خاطر یہ معرکہ سر کرنا چاہتا ہے۔ یا شاید گہنا نے ہی اسے یہ مشورہ دیا ہو۔ میرے ذہن میں خیال آتے چلے گئے اور میرے دل میں پہلی بار رقابت نام کے سنبو لیے نے جنم لیا۔ اس روز مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ رقیب لفظ ہی سے دل کی شریانوں میں کتنا کڑواں ہر پھیل جاتا ہے کہ جس کا ذائقہ ہمیں اپنے پینے والے پانی میں بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں نے بھی ایک گھونٹ پی کر باقی پانی زمین پر پھینک دیا۔ آج مجھے ہر چیز کڑوی لگ رہی تھی۔

تو گویا ستارہ کے نام پر وہ چھیڑ چھاڑ صرف دل لگی کی خاطر تھی، اور اس نے آخر یہ کیسے سوچ لیا کہ میری توجہ کا محور ستارہ ہو سکتی ہے.....؟ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اس پاکیزہ ہستی کے لیے ہمیشہ اچھا سوچا اور کسی نہ کسی طور اس کے دکھوں کے مداوے کی کوشش بھی کی مگر اس میں میرے کسی ذاتی غرض کو کب دخل حاصل تھا؟ اس ستارہ کی پلکوں کی نمی مٹانے کے لیے تو کچھ بھی کیا جاسکتا تھا۔ مگر گہنا نے میرے ستارہ سے



اس بے غرض اور عقیدت بھرے التفات کو اتنا غلط کیسے سمجھ لیا۔ دفعۃً میرے ذہن میں ایک اور شک نے سر اُبھارا ”کہیں خود ستارہ کو بھی تو ایسا نہیں لگتا ہوگا؟“ نہیں نہیں..... وہ ایک سمجھدار لڑکی ہے اور زمانے کے سرد و گرم سے خوب آشنا ہے۔ وہ کبھی میرے بارے میں ایسا کوئی غلط اندازہ نہیں لگا سکتی..... لیکن گہنا..... آخر وہ کیوں میری نظر کا مطلب نہیں سمجھ پائی؟ کیا میری نظر اسی قدر بے زبان تھی کہ وہ اپنا مفہوم بھی کہنا تک نہیں پہنچا سکی۔ کون کہتا ہے کہ نگاہوں کی زباں ہوتی ہے۔ میری بصارت تو گویائی سے محروم ثابت ہوئی تھی۔ میں جتنا سوچتا گیا، اتنا ہی الجھتا چلا گیا۔ کہتے ہیں من کی گریں ذہن و دل میں بہت زیادہ الجھ جائیں تو نتیجہً جسم کو جھکنٹا پڑتا ہے میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور شام سے پہلے ہی میرا بدن تیز بخار میں پھٹکنے لگا۔ اسماعیل کی کام سے میرے کمرے میں آیا تو مجھے یوں آڑھا تر چھا بستر پر پڑا دیکھ کر گھبرا سا گیا اور پھر میرا ہاتھ چھوتے ہی وہ باہر کی طرف لپکا۔

کچھ ہی دیر بعد علاقے کا مشہور ڈاکٹر اپنے نائب کے ساتھ میرے سر ہانے موجود تھا۔ اس نے حرارت تشخیص کی اور مکمل آرام تجویز کیا لیکن کیا صرف جسم کو آرام دینے سے دل کے سب درد دور ہو جاتے ہیں؟ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ یہ ظاہری سکون ہمارے اندر کی بے تابی کو اور بڑھا دیتا ہے۔ انسان چلتا پھرتا رہے اور دھیان کسی طرف بٹا ہو تو بڑی غنیمت ہے ورنہ خالی ذہن کے ساتھ یوں کسی بند کمرے میں پڑے رہنے سے تو اندر کے طوفان اور سوا ہو جاتے ہیں۔ آدھی رات کے قریب میں بھی اپنے اندر کی اس جنگ سے جھنجھلا کر باہر صحن میں نکل آیا۔ میں نے اپنے جسم پر وہی بستر پڑا کھس لپیٹ لیا تھا۔ باہر صحن کے آسمان پر میرے سارے دوست چمک رہے تھے۔ ان میں سے ایک چمکیلا تارہ بولا ”ہم نے کہا تھا تا..... ہمارے سوا کسی سے دل نہ لگتا..... یہ انسان بڑے بے مروت ہوتے ہیں۔ یہ بھلا تمہاری محبت کی قدر کیا جانیں..... چلو بھول جاؤ سب..... اور پھر سے ہمارے دوست بن جاؤ.....“ کاش انسان کا حافظہ ہی اس کے اختیار میں ہوتا تو شاید باقی کسی مزید اختیار کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ مگر انسان تو سدا کا ”مجبور محض“ ہے۔ میں بھی انہی لاچاروں میں سے ایک تھا جو اس حافظے کے عذاب کے ساتھ صحن میں حوض کے قریب بنے چو بارے پر بیٹھا خود سے لڑ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ بڑے احاطے سے صحن کی طرف آنے والے راستے پر کوئی آہٹ سی ہوئی اور کسی نے کڑکدار آواز میں پوچھا ”کون ہے وہاں.....“ میں نے جواب دیا ”آیان“ آواز دینے والا اندھیری ڈیوڑھی سے صحن کی تاروں بھری روشنی میں آ گیا۔ وہ ”موسیٰ“ تھا ”اوئے شہزادے..... سب خیر تو ہے نا..... اسماعیل تو بتا رہا تھا کہ تجھے سخت بخار ہے پھر تو یہاں صحن میں کیا کر رہا ہے اس وقت۔“ ”موسیٰ میری جانب چلا آیا۔ ”بس اندر کمرے میں دم گھٹ رہا تھا..... اس لیے باہر کھلی ہوا میں آ کر بیٹھ گیا۔“ ”موسیٰ نے میرا ہاتھ چھوا.....“ ”بخار تو اب بھی ہے۔ یہ کون کون سے روگ لگا رکھے ہیں تو نے اپنی جوانی کے ساتھ.....؟“ ”موسیٰ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں نے دھیرے سے کہا ”ساری زندگی ہی روگ ہے شاید..... تم آدھی رات کو کیا کر رہے تھے یہاں.....“

موسیٰ نے لمبی سانس بھری ”یہاں دن سے زیادہ رات کو ہوشیار رہنا پڑتا ہے شہزادے..... گھٹات لگانے کے لیے دن سے زیادہ رات مددگار ہوتی ہے..... رات ہمیشہ دشمن کی دوست ہوتی ہے.....“ میں نے چاروں طرف چھائے اندھیرے کو دیکھ کر کہا ”ٹھیک کہا تم نے..... رات سے بڑا

دشمن شاید اور کوئی نہیں.....“ موسیٰ نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”سچ بتا۔۔۔۔۔ تجھے کسی سے عشق تو نہیں ہو گیا۔؟۔۔۔۔۔ تیری آنکھیں بولتی ہیں کہ تو اپنا سب کچھ ہار چکا ہے۔“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی ”کیوں..... کیا چاقو بازی کی طرح اس میدان کے بھی کھلاڑی رہے ہو کبھی.....؟ تو بتاؤ پھر کیسا تجربہ رہا.....؟“

موسیٰ بھی مسکرا دیا ”چاقو کی دھار تو پھر بھی نظر آ جاتی ہے پیارے لیکن اس بے بخت عشق کی دھار کا تو اندازہ بھی نہیں لگا پاتا انسان اور اگلے لمحے ہی زمین پر پڑا اپنے ہی خون میں تڑپ رہا ہوتا ہے..... اسی تڑپ سے گزرنے کے بعد ہی تو چاقو اٹھایا تھا میں نے.....“

موسیٰ کی آہ نے ہی مجھے اس حقیقت سے آشنا کر دیا تھا کہ وہ بھی محبت کی اس دودھاری تلوار سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ میں نے نوہ لینے کے لیے اس سے پوچھا ”اس دھار کی کک کچھ کم ہوئی یا ابھی باقی ہے.....“ موسیٰ کہیں دور خلا میں دیکھتا رہا ”نہیں شہزادے..... شروع شروع میں تو میں بھی یہی سمجھا تھا کہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ زخم بھی بھر ہی جائیں گے مگر میں غلط تھا۔ عشق کا ناسور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مزید لا علاج ہوتا جاتا ہے..... اور ظلم تو یہ ہے کہ نہ یہ انسان کو پوری موت دیتا ہے اور نہ ہی مکمل زندگی..... بس انسان ساری عمر برزخ میں ہی گزار دیتا ہے.....“

میں حیرت سے موسیٰ کو دیکھتا رہا۔ بظاہر اوپر سے فولاد نظر آنے والا یہ انسان اندر سے کتنا پتھیل چکا تھا، لیکن اب بھی دن رات جل رہا تھا۔

پھر اچانک موسیٰ جیسے ہوش میں آ گیا۔ ”میری ایک بات مانے گا شہزادے.....؟“

”ہاں..... بولو.....“ موسیٰ نے میرا ہاتھ تھام لیا ”تو اپنے گھر واپس چلا جا..... یہ جگہ تیرے لیے نہیں بنی ہے۔ میری اور رنگا بھائی کی زندگی کا کچھ پتہ نہیں، چاروں طرف گلدھ منڈلاتے پھرتے ہیں..... ابھی وقت ہے تیری واپسی کا..... ورنہ پھر عمر بھر کے لیے خوار ہو جائے گا..... تیرا باپ بڑا شریف انسان ہے..... اس کے غصے کا برانہ منایا کر.....“ میں نے موسیٰ کا ہاتھ تھپتھپایا ”کچھ فیصلے انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے موسیٰ بھائی..... میرا خیر اس گھر سے کہیں پرے اٹھایا گیا ہے..... میں جانتا ہوں کہ گھر چھوڑ کر میں نے اچھا نہیں کیا..... لیکن وہاں رہتا بھی تو ہر روز انہیں کوئی درد یا تکلیف دیتا رہتا..... تو پھر کیوں نالیک ہی باریہ جھنجھٹ ختم کر دیا جائے..... میرے ابا جو مجھ سے چاہتے ہیں وہ میں چاہ کر بھی نہیں کر پاتا۔ ان کے دکھاوے کے لیے دو چار دن ویسا بن بھی جاؤں تو پانچویں دن ضرور خود سے ہی ٹکرا جاتا ہوں..... کاش میرے اندر خود کو تبدیل کرنے کی صلاحیت ہوتی.....“

موسیٰ میری بات سن کر سر ہلاتا رہا جیسے اسے آدمی بات سمجھ میں آئی ہو اور آدمی نہیں۔ میں نے بات کا رخ موڑنے کے لیے اس سے پوچھا ”اسماعیل بتا رہا تھا کہ یہاں باقاعدہ چاقو بازی کی مشق سیکھنے کے لیے شاگردی اختیار کرنا ضروری ہے۔ کیا تم مجھے اپنی شاگردی میں لوگے۔ مجھے یہ فن سکھا دو گے۔؟“ موسیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی ”ہاں۔۔۔۔۔ باقاعدہ شاگرد بننا ہے تو ضروری۔۔۔۔۔ پر تم کیوں سیکھنا چاہتے ہو یہ سب۔۔۔۔۔ ہماری دنیا سے باہر اس ہنر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہاں مرنے والے اور مارنے والے دونوں کو بڑی جلدی ہوتی ہے۔ بس ایک گولی چلتی ہے چالیس، پچاس روپے والی۔۔۔۔۔ اور کھیل ختم۔۔۔۔۔“

”تم نے ابھی کہا تھا نا کہ تم بھی کسی دوسرے درودی دھار مٹانے کے لیے چاقو کی دھار کی طرف آئے تھے، تو بس یوں سمجھ لو کہ میرا بھی کچھ

ایسا ہی معاملہ ہے۔ مجھے بھی ایک زہری کاٹ ختم کرنے کے لیے دوسرا زہر پینا ہے۔ کیا تم اس میں میرا ساتھ دو گے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری تربیت مکمل ہونے تک یہ بات راز میں ہی رہے تو بہتر ہے۔“ موسیٰ نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو پھر موسیٰ حاضر ہے۔ لیکن راز رکھنے کے لیے ہمیں بڑے احاطے سے دور رہنا ہوگا۔ میں روزانہ تمہیں اس صحن میں آکر سبق دے جایا کروں گا۔ یہاں سب میرے اپنے اعتماد کے لوگ ہوتے ہیں۔ بات باہر نہیں جائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ اور ہاں۔ تمہاری باقاعدہ شاگردی کا اعلان بھی اب اسی وقت ہوگا جب تم اپنی تربیت مکمل کر لو گے۔ میں خود رنگا بھائی سے کہہ کر تمہاری کلائی پر دھاگا بندھاؤں گا۔“ موسیٰ میرا سر سہلا کر وہاں سے اٹھ کر چل دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اپنے جسم کو روزانہ اس قدر تھکا دوں گا کہ اس کے ریشے ریشے سے ٹوٹنے کی الگ آواز سنائی دے تاکہ میرے ذہن کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔ حافظہ اگر خود سے چھینا نہیں جاسکتا تو کیا ہوا۔ اس پر شدید تھکن سے ٹوٹنے جسم کا غلاف تو ڈالا جاسکتا ہے۔

موسیٰ نے میری تربیت کا وقت صبح فجر کے بعد کا چنا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت آس پاس برائے نام چہل پہل ہوتی تھی اور دس بجے سارا رنگا کا دفتر لگنے تک بمشکل ہی کوئی اس صحن کی طرف آتا تھا۔ اسماعیل پہلے ہی دن سے ہمارا راز دار تھا اور صحن کی جانب کے کارندوں اور نوکروں کو موسیٰ نے اپنی خاص زبان میں سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کسی کو اس طرف ہوتی کارروائی کی بھینک نہیں پڑنی چاہئے۔ میں نے احتیاطاً اسماعیل کے ہاتھ ایک رفیعے میں رجبہ کو لکھ بھیجا تھا کہ میں چند دن تک شاید ان سے رابطہ نہ کر پاؤں اس لیے وہ پریشان نہ ہوں۔ میں نے اسے یہی بات طریقے سے ریحان کو بھی منتقل کرنے کی ہدایت کر دی تھی کہ وہ چھوٹی اور امی کو میری طرف سے اطمینان دلادے کہ میں ٹھیک ہوں اور ابا کی شرط کے مطابق کچھ ”بننے“ کی کوشش میں ہوں لہذا وہ لوگ میری جانب سے خود کو ہلکان نہ کریں۔ ناہید کی ٹیوشن کا سلسلہ البتہ جاری رہا، لیکن میں نے ٹیوشن کا وقت بدل دیا تھا۔ اب میں مغرب کے اندھیرے میں یعقوب مینشن سے نکلتا اور رات نو بجے تک واپس لوٹ آتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی مجھے دن کی روشنی میں باہر دیکھے۔ یا شاید میں اپنے آپ سے چھپنے کے لیے اس اندھیرے کا سہارا لے رہا تھا۔

شروع شروع میں موسیٰ نے مجھے خود میری کلائی پر قابو پانے کے طریقے کی مشق کروائی۔ کلائی کا کون سا پٹھا اور کون سی رگ کب اور کس طرح خود اپنی مرضی سے حرکت میں لائی جاسکتی ہے۔ اس کی خصوصی تربیت کے بعد ہی بات آگے بڑھ سکتی تھی۔ ابتدائی چار پانچ دنوں تک تو چند منٹ کے اندر ہی میرے بازوؤں کے پٹھے کھینچے اور رگیں یوں ترخنے لگتی تھیں کہ میں بمشکل اپنی جینوں کا گلا گھونٹ پاتا تھا۔ واقعی موسیٰ ایک ماہر استاد تھا اور اس نے دل و جان سے اپنا سارا اثاثہ دن بدن میری جانب منتقل کرنے کی ٹھان لی تھی۔ مشق کے بعد میری حالت کچھ اتنی ابتر ہو جاتی تھی کہ گھنٹوں مجھے اپنی دونوں کلائیوں کے ساتھ لکڑی کی پتلی کھچیاں باندھ کر درد پر قابو رکھنا پڑتا تھا۔ شام کے اوقات میں موسیٰ وقت نکال کر مجھے چاقو بازی کی دوسری جزئیات کے بارے میں بتاتا رہتا، مثلاً نظر رکھنے کا فن، قدموں کو کس توازن سے کب اور کس طرف جھکانا ہے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چاقو منتقل کرتے وقت حریف کی کس کس حرکت کو جانچنا پڑتا ہے۔ چاقو پر کب اور کتنی مضبوط گرفت رکھنا ضروری ہے۔ وغیرہ وغیرہ غرض اب میں اور موسیٰ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے جب بھی وقت ملتا صرف ایک ہی موضوع پر بات کرتے تھے اور وہ تھا صرف اور صرف موسیٰ کا یہ فن۔ دوسرے بیٹے کے اختتام پر موسیٰ نے مجھے مختلف زخموں کی اقسام کے بارے میں سبق دینا شروع کر دیا کہ کس زخم کے لیے کتنی دھار اور گہرائی کی ضرورت ہوتی



ہے اور پہل بھر میں ہی صرف چاقو کی پانچ سٹی میٹر کی نوک سے مخالف کے جسم پر کتنے نقش و نگار بنائے جاسکتے ہیں۔ موسیٰ ہر بار مجھ سے یہی کہتا کہ جس کے ہاتھ میں چاقو ہو اور اگر وہ ”اصل“ ہو تو پھر اس کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس فن کی حرمت کا پاس رکھے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے کہ جس سے دوسرے چاقو بازوں کی عزت پر کوئی حرف آجائے۔

شاید وہ میری تربیت کا سولہواں دن تھا۔ موسیٰ مجھے بتا رہا تھا کہ چاقو پر ہتھیلی کا دباؤ کب اور کتنا رکھا جائے کہ جس سے مخالف کو وار سمجھنے میں دشواری ہو۔ ہم اب صحن کے احاطے میں ایک کچی جگہ پر باقاعدہ کچی مٹی اور ریت میں دائرہ ڈال کر ایک دوسرے کے مقابل آکر وار کرتے ہوئے یہ مشق کرتے تھے۔ اچانک صحن کے بڑے دروازے پر زور کی دستک ہوئی اور موسیٰ کا وار چوک گیا۔ مجھے یوں لگا کہ میرے ہاتھ شائے میں انگارے سے بھر گئے ہیں۔



## مانڈ بلاسٹر

**مانڈ بلاسٹر**، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک اور تیز رفتار اور ایکشن سے بھرپور سائنسی ناول ہے۔ اس ناول میں ایک ایسے ہی سائنسی آلے کا استعمال پاکیشیا کے فوجی کمانڈروں کے خلاف کیا گیا جو بہت، ساخت اور کام کے لحاظ سے صرف عام سائنسدانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عمران کے لئے بھی بالکل نیا تھا۔ پاکیشیا کے ڈیڑھ سو کمانڈوز کو جیتے جاگتے ہلاک کر دیا گیا اور وہ ہاتھ تک نہ ہلا سکے جبکہ انہیں کسی گیس یا ریز سے بے ہوش یا بے حس و حرکت بھی نہ کیا گیا تھا بلکہ ان کو صوتی لہروں کی مدد سے گہری نیند سلا یا گیا تھا، ایسی نیند جو ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہی۔ پھر پاکیشیا کے ایٹمی تنصیبات پر ان صوتی لہروں سے حملہ کیا گیا اور پاکیشیا کی ایٹمی تنصیبات کے تمام سائنسدان بہتر گھنٹوں تک باوجود سرتوڑ کوششوں کے نیند سے نہ جاگ سکے۔

کیا پاکیشیا کی ایٹمی تنصیبات جن کی حفاظت کے لئے پاکیشیا کی حکومت ہر سال کروڑوں ڈالر خرچ کرتی ہے کا دفاعی نظام اس قدر کمزور تھا؟ اس پورے کھیل میں عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس صرف ناچنے رہ گئے اور دشمن مسلسل پاکیشیا کو نقصان پہنچاتا رہا۔ پھر جب عمران کو دشمن اور اس آلے مانڈ بلاسٹر کا پتہ چلا تو عمران اور اس کے ساتھی دیوانہ وار اس آلے کو ختم کرنے اور دشمن ملک سے انتقام لینے کے لئے میدان میں کود پڑے۔ یہ انتقام تھا پاکیشیا کے ڈیڑھ سو کمانڈوز کے خون کا انتقام۔ اور جب عمران انتقام پر آجائے تو کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں جاننے کے لئے پڑھیے ناول ”مانڈ بلاسٹر“۔

”مانڈ بلاسٹر“ کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## باب 17

دراصل غلطی موسیٰ کی نہیں تھی۔ میں خود ہی دستک کی تیز آواز سن کر کچھ ایسا چونکا کہ موسیٰ کے اشارہ کرنے کے باوجود اپنا قدم پیچھے نہ لے سکا اور چاقو کی زد میں آ گیا۔ بل بھر میں میرا سفید کرتا شانے کی جانب سے سرخ ہونا شروع ہو گیا۔ موسیٰ نے گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا اور اسماعیل کو اشارہ کیا کہ آنے والے کو سنبھالے جب کہ مجھے برآمدے میں لے جا کر اس نے شانے کی جانب سے میرا کرتا پھاڑ کر جلدی سے زخم کا جائزہ لیا۔ ”شکر ہے زخم زیادہ گہرا نہیں ہے شہزادے۔۔۔۔۔ لیکن مرہم پٹی ضروری ہے۔۔۔۔۔“ کچھ ہی دیر میں حویلی کا ہی ایک نوکر جوڈپنسر کا کورس بھی کر چکا تھا میری مرہم پٹی کر رہا تھا۔ دروازے پر رنگا کا ہی کوئی خاص کارندہ تھا جس نے موسیٰ کو بتایا کہ باہر دروازے پر پولیس آئی ہے۔ موسیٰ معاملہ دیکھنے چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں آ کر نیچے سے سرنگا کر لیٹ گیا اور جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ شاید یہ اس مسکن دوا کا اثر تھا جو مرہم پٹی کرنے والے نے مجھے درد دور کرنے کے لیے چند گولیوں کی صورت میں دی تھی۔

میری آنکھ پھر دوپہر کو ہی کھلی جب اسماعیل میرے لیے کھانے لے کر آیا ”اب کیسی طبیعت ہے۔۔۔۔۔“ میں نے اٹھ کر نیچے سے ٹیک لگا لیا ”بہتر ہوں۔۔۔۔۔ معمولی زخم ہے۔۔۔۔۔ بھر جائے گا۔۔۔۔۔“ اسماعیل نے ہمدردی سے میری جانب دیکھا ”کیوں خود کو اتنا ہلکان کرتے ہو۔۔۔۔۔ کیا شیخ صاحب کے گھر والوں سے کوئی ان بن ہو گئی ہے۔۔۔۔۔؟“ مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ اسماعیل کو میرے اندر کی خبر کیسے ہو گئی۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔؟ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ اسماعیل نے کھانا چھتے ہوئے جواب دیا ”تم بہت دنوں سے ان کی طرف گئے جو نہیں۔۔۔۔۔ ان کی بڑی بیٹی نے ناہید بیٹی کی طرف تمہارے لیے پیغام بھی بھجوایا تھا مگر تم پھر بھی نہیں گئے۔۔۔۔۔“

دوروز پہلے ہی میں کسی وجہ سے ناہید کے ہاں نہیں جا پایا تو میں نے اسماعیل کو پیغام دینے کے لیے کہلا بھیجا تھا۔ اسی روز ناہید نے اسماعیل کو یہ بتایا تھا کہ ستارہ نے شیخ صاحب کے ذریعے پیغام بھجوایا ہے کہ وہ سب میری اتنی لمبی غیر حاضری سے بہت پریشان ہیں لہذا میں پیغام ملتے ہی ضرور شیخ صاحب کے ہاں ہواؤں، لیکن میں نے اسماعیل کی سنی ان سنی کرتے ہوئے ناہید کو بھی صرف ہوں ہاں کر کے ہی مال دیا تھا کہ ”کچھ مصروفیت ہے وقت ملتے ہی چلا جاؤں گا۔“ ناہید کو تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں کتنے دنوں سے خود کو محبوس کیے بیٹھا ہوں۔ کھانا کھانے کے دوران بھی اسماعیل مجھے غور سے دیکھتا رہا ”صرف یہی بات نہیں ہے بابو۔۔۔۔۔ بات کچھ اور بھی ہے جو تم اسماعیل کو بتانا نہیں چاہتے۔۔۔۔۔“

میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا ”اور بھلا کیا بات ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ تم جانتے تو ہو کہ صبح دو گھنٹے کی یہ سخت تربیت کیسے میرا جوڑ جوڑ ہلا دیتی ہے۔ پھر دن بھر کہیں جانے کے قابل ہی کب رہتا ہے انسان۔۔۔۔۔؟“

اسماعیل نے میرے لیے پانی جگ سے گلاس میں ڈالا ”نہیں بابو۔۔۔۔۔ جب تم شیخ صاحب کے گھر سے ہو کر آتے تھے تو تمہارے چہرے پر ایک خاص روشنی ہوتی تھی۔ ایک میٹھی سی مسکراہٹ۔۔۔۔۔ پورے بابو لگتے تھے تب تم۔۔۔۔۔“

مجھے ہنسی آگئی۔۔۔۔۔ ”تو اب کیا آدھا رہ گیا ہوں۔۔۔۔۔“ اسماعیل کی آواز میں درد تھا ”کاش آدھے ہی رہ جاتے۔۔۔۔۔ پر تم تو خود کو پورا ختم کرنے کے درپے ہو۔۔۔۔۔ خود کو اتنا آزار نہ دو۔۔۔۔۔ مر جاؤ گے۔۔۔۔۔“

میں چپ رہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ عشق نامی بیماری اپنے ساتھ کچھ ایسی مہر س بھی ہماری پیشانیوں پر چھاپ جاتی ہے کہ پھر سارا زمانہ انہیں ہماری جبینوں پر جگمگاتے دیکھ کر ہمارے اندر کے حال سے واقف ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے یہ محبت بیماری کم اور بدنامی زیادہ کہلاتی ہے۔

شام تک دوبارہ موسیٰ بھی میرا حال احوال پوچھنے کے لیے چھوٹے صحن کی طرف چکر لگا گیا تھا۔ میں نے اس سے پولیس کے معاملے کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ بازار میں سینڈ وی کسی سے ہاتھ پائی ہوگئی تھی اور جلدی میں چاقو غلط چل جانے کی وجہ سے مخالف کچھ زیادہ گھائل ہو گیا تھا۔ لہذا سینڈ کو وہاں سے لٹکانا پڑا۔ پولیس اسی کی تفتیش کے لیے یعقوب مینشن کے دروازے تک آئی تھی پر سینڈ کی ضمانت قبل از گرفتاری کے کاغذ دیکھ کر واپس چلی گئی۔ یہ وہی سینڈ تھا جس نے اس روز مجھے پنجہ بازی کے مقابلے میں شکست دی تھی۔ کھلے دل کا لڑکا تھا اور بعد میں جتنی بار بھی میرا اور اس کا بڑے احاطے میں آنا سامنا ہوا اس نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ میرا حال احوال پوچھا تھا۔ درمیان میں سارنگا نے بھی ایک آدھ بار آتے جاتے مجھے ٹوکا تھا کہ آج کل میں کہاں غائب رہتا ہوں کہ میری کچھ خبر ہی نہیں ملتی، لیکن ہر بار میں کوئی بہانہ بنانے میں کامیاب ہو ہی جاتا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں سارنگا اس نواب ویر کے مسئلے میں بری طرح الجھا ہوا تھا جو کچھ روز پہلے اپنے ان جان دشمن کی کھوج لگانے میں سارنگا کی مدد لینے آیا تھا۔ اسماعیل نے مجھے بتایا کہ اب تک سارنگا کو اس معاملے میں اس لیے بھی کامیابی نہیں مل سکی تھی کیونکہ نواب دیر کی ”زمر دھولی“ کالی کے علاقے میں پڑتی تھی۔ وہی کالی دادا جسے سارنگا نے ٹکروے کر اس سے یہ علاقہ چھینا تھا جس پر آج کل سارنگا کا راج تھا۔ میں نے اسماعیل سے کالی کے بارے میں تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ اس کے اور سارنگا کے درمیان ہمیشہ سے ہی کانٹے کی ٹکری رہی ہے۔ دونوں میں کسی نہ کسی بات پر ٹھنسی ہی رہتی ہے اور آج کل وجہ تنازع نواب دیر کی زمر دھولی ہے، کیونکہ زیر زمین دنیا کے اصول کے مطابق کوئی بھی دوسرے کے علاقے اور سرکار میں مداخلت نہیں کر سکتا، لیکن سارنگا اپنے محسن ابراہیم کے بیچے ہوئے سائل کو یوں خالی ہاتھ بھی تو نہیں لوٹا سکتا۔ لہذا معاملہ گھمبیر ہوتا جا رہا ہے۔

ابراہیم وہ شخص تھا جس نے سارنگا کی حب مدد کی تھی جب وہ صرف یعقوب فورمین تھا اور اپنی خون پسینے کی کمائی لوٹنے والوں سے حساب کتاب کے لیے دعویٰ سے واپس اپنے ملک پہنچا تھا۔ تب ابراہیم نے یعقوب کو اس وقت ہناہ دی تھی جب ساری دنیا اس کے خلاف ہو چکی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ ابراہیم جو خود بھی اس وقت اس علاقے کا نامور استاد تھا اس نے یعقوب کو اپنے وفادار بھی فراہم کیے تھے جنہوں نے یعقوب کو اس کا حق دلانے میں بھرپور مدد کی تھی۔ ابراہیم بہت عرصہ قبل یہ شہر چھوڑ چھاڑ کر اپنے آبائی گاؤں میں سکون کی زندگی گزار رہا تھا اور اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کی سفارش کی تھی، تو پھر ایسے میں سارنگا اپنے محسن کے سفارش کردہ شخص کی مدد سے کیسے دست بردار ہو جاتا۔ اسی لیے وہ دن رات نواب دیر کے معاملے میں ہی جتا رہتا تھا اور میرے لیے سارنگا کی یہ ہمہ وقت مصروفیت بہت سودمند ثابت ہو رہی تھی کیونکہ میں اپنی پوری توجہ اپنی تربیت پر مرکوز کر سکتا تھا۔

شام تک میرے درد کو کافی آرام آچکا تھا لیکن اسماعیل پھر بھی ضد کر کے مجھے پٹی بدلنے کے لیے قریبی کلینک تک لے گیا۔ مقصد کچھ دیر کے لیے مجھے کمرے کے گھٹن زدہ ماحول سے نکالنا بھی تھا۔ کلینک سے نکلتے نکلتے ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ ناہید بہت دنوں سے مجھ سے شکوہ کر رہی تھی کہ



اب میں صرف پڑھائی کے وقت ہی آتا ہوں اور بنا اس کے ہاتھ کی چائے پیئے ہی ٹیوٹن دے کر واپس بھاگنے کی کرتا ہوں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آج یعقوب مینشن سے نکل ہی آئے ہیں تو ناہید کا یہ شکوہ بھی دور کر دوں۔ ویسے بھی اس کا کورس تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور اگلے ہفتے سے اس کے سالانہ امتحانات بھی شروع ہونے والے تھے۔ لہذا یہ ٹیوٹن کا سلسلہ بھی اب دو چار دن کا ہی مہمان تھا، لیکن شاید میں نے ناہید کے ہاتھ کی چائے پینے کے لیے اس روز جو وقت چنا تھا۔ وہ میری تقدیر کے پھیرے کی طرح مجھ پر الٹا پڑنے والا تھا۔

میں جب ناہید کے گھر پہنچا تو برآمدے میں ہی مجھے اندر سے کسی کے ہنسنے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں سمجھا حسب معمول بوا کی پرانی جان پہچان والیاں اس سے ملنے آئی ہوں گی مگر کاش میں کمرے میں داخل ہونے سے پہلے مہمانوں کے بارے میں تصدیق کر لیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے قدم جم سے گئے۔ سامنے ناہید کے ساتھ ستارہ اور گہنا بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو میرے سارے حواس ہی معطل ہو گئے اور میں نے غیر ارادی طور پر واپسی کے لیے قدم اٹھائے، مگر مجھے یوں تیزی سے پلٹنے دیکھ کر ناہید بولی..... ”ارے ارے..... آیاں بھیا۔ واپس کہاں چل دیے..... یہ کوئی غیر نہیں..... ستارہ اور گہنا ہیں۔“ تب تک ان دونوں کا چہرہ ناہید کی جانب تھا۔ میرا نام سن کر ان دونوں نے چونک کر مجھے پلٹ کر دیکھا۔ اب میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ گہنا نے شوخی سے کہا ”اچھا تو یہ جناب یہاں چھپے بیٹھے ہیں اور ہم پورے شہر میں ان کی گم شدگی کے ڈھنڈورے پیٹتے پھرتے ہیں..... کہاں تھے آپ اتنے دنوں.....؟“۔

”بس یونہی..... کچھ مصروفیت تھی.....“ گہنا نے فوراً ستارہ سے شکایت کی ”دیکھا آپنی..... یہ ہم ہی ہیں جو ان کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں انہیں تو ہماری کوئی فکر نہیں.....“ ستارہ نے بھی وہی لفظوں میں مجھ سے شکوہ کیا ”ابا بھی آپ کے لیے بہت پریشان ہیں..... آپ نے پھر دوبارہ ہمارے گھر کا چکر ہی نہیں لگایا.....“

ناہید کا خیال نہ ہوتا تو شاید میری زبان سے کوئی تلخ حقیقت بیان ہوئی جاتی کہ ”مجھ جیسے برے انسان کا ان کی نگلی سے دوڑ رہنا ہی بہتر تھا، کہیں میری بدنامی کے چھیننے ان کے در پر نہ پڑ جائیں.....“ لیکن میں چپ رہا۔ ستارہ میری خاموشی کو بھانپ گئی اور پھر آخر وقت تک وہ میرے چہرے پر نہ جانے کیا کھوجتی رہی۔ گہنا البتہ ویسے ہی گن گنی اور بہانے بہانے سے مجھے چھیڑتی رہی۔ وہ آج آسمانی کرتا شلوار اور سیاہ شال میں ملبوس تھی۔ گویا آسمان نے سیاہ شال اوڑھ رکھی تھی۔ خیرہ کن اور نظر لگ جانے کی حد تک دل کش..... مگر افسوس..... وہ آسمان میرا نہ تھا۔

آخر ستارہ نے مجھ سے پوچھ ہی لیا ”آپ کچھ چپ سے ہیں آج.....؟ سب ٹھیک تو ہے نا.....“ میں چونک سا گیا ”جی..... جی بالکل..... بالکل ٹھیک ہوں..... آپ بتائیے..... نئی سیکلی کے ساتھ دل لگ گیا ہے آپ کا.....“ ناہید میرا اشارہ سمجھ کر ہنس دی۔ ”آیاں بھیا، اب تو میری ایک نہیں..... دودو سہیلیاں ہیں..... آپ گہنا کو بھول گئے کیا؟“۔

”نہیں..... انہیں کون بھول سکتا ہے.....“ میں گہنا کی طرف مڑا ”آپ سنائیں..... آپ کے تنویر بھیا نے سی ایس ایس کی تیاری کر لی..... کب حصہ لے رہے ہیں وہ مقابلے کے امتحان میں.....؟“

گہنا اپنی رو میں بولتی رہی ”دیکھیں..... شاید اگلے ماہ بیٹھیں وہ تحریری امتحان کے لیے..... تیاری تو انہوں نے واقعی بڑی زبردست کی

ہے۔ بس اب دعا کریں کہ وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو کر جلدی سے انفرنگ جائیں۔۔۔۔۔ میں نے غور سے اس کی جانب دیکھا ”میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔۔۔۔۔ اور اس کے ساتھ بھی جس کے لیے آپ مجھے دعا کرنے کا کہہ رہی ہیں۔۔۔۔۔“

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے ناہید سے واپسی کی اجازت طلب کی ”کچھ دیر تو بیٹھیں آیان بھائی، ستارہ اور گہنا جائیں تو چلے جائے گا۔ ان کے لبا انہیں لینے کے لیے بس آتے ہی ہوں گے۔۔۔۔۔“

”نہیں مجھے اسماعیل کے ساتھ کسی ضروری کام سے جانا ہے۔۔۔۔۔ وہاں مینشن میں بھی میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔۔۔۔۔ پھر ملاقات ہوگی۔۔۔۔۔“ میں بات ختم کر کے سلام کرتے ہوئے کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں آ کر میرا جی چاہا کہ ایک بار اور اسے جی بھر کے دیکھ لیتا تو کیا تھا لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے دل کی اس معصومی خواہش کو بری طرح کچل ڈالا۔ یہی چھوٹی چھوٹی اور بظاہر معصوم سی خواہشیں ہمیں آس اور آرزوؤں کے گھنے جنگل میں اس پتلی سی پگڈنڈی تک لے جاتی ہیں۔ جس کا اختتام بالآخر عشق کی اس اندھی اور گہری کھائی میں ہوتا ہے جہاں گرنے کے بعد آج تک کوئی عاشق سلامت واپس نہیں آیا۔ میں برآمدے میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ پیچھے سے ستارہ کی ملائم آواز نے میرے قدم روک لیے ”سینے۔۔۔۔۔“ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ خود ہی قدم بڑھاتی میرے قریب چلی آئی، اس کا سر جھکا ہوا اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اگر ان دو بہنوں کو ایک جیسے کپڑے پہنا دیے جاتے تو شاید ان میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو جاتا لیکن دونوں کے حراج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یا پھر شاید ستارہ کی یہ سنجیدگی اس کی بیوگی کی دین تھی؟

اس نے حسب معمول اپنی سانس درست کرنے میں کچھ لمحے صرف کیے ”آیان۔۔۔۔۔ کیا آپ ہم لوگوں سے کچھ ناراض ہیں۔۔۔۔۔؟ شاید ہم لوگوں سے انجانے میں کوئی خطا ہوگئی ہے۔۔۔۔۔؟“

میں ہڑبڑا سا گیا۔ ستارہ سے ایسے کسی سوال کی توقع ہرگز نہیں کر رہا تھا ”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کے دل میں ایسا خیال آیا کیسے۔۔۔۔۔“ اس نے نظریں اٹھائیں ”بس یونہی۔۔۔۔۔ آپ اتنے دن سے گھر بھی نہیں آئے۔۔۔۔۔ نہ ہی اپنی کوئی خیر خبر دی۔۔۔۔۔“

”بس مصروفیات ہی کچھ ایسی ہوگئی ہیں کہ یعقوب مینشن سے نکلنا ہی نہیں ہوتا، اور پھر سچ تو یہ ہے کہ میرا تعلق اب ایسی جگہ سے جڑ گیا ہے کہ جس کے نام کی کالک آپ کے آگن سے دور ہی رہے تو بہتر ہے۔“

ستارہ نے تڑپ کر میری جانب دیکھا ”آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ کوئی جگہ اچھی یا بری نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ ہم اپنے رویوں سے اسے ایسا بناتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کا کردار کیا ہے یہ ہمارا پورا گھرانہ اچھی طرح جانتا ہے۔۔۔۔۔“

میرے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی نکل گیا۔۔۔۔۔ ”لیکن شاید گہنا ایسا نہیں سمجھتی۔۔۔۔۔“ ستارہ میری بات سن کر کچھ دیر خاموش رہی۔ ”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ اس دن رافہ نے آپ کے کہنے پر ہی گہنا سے آپ کے بارے میں اس کی رائے جاننے کی کوشش کی تھی، لیکن آپ میرا یقین کریں۔ وہ ابھی بہت نادان ہے۔۔۔۔۔ اسے زندگی کی بہت سی باتوں کی بالکل سمجھ نہیں ابھی۔۔۔۔۔ اور اس نے جو کچھ بھی کہا اس میں آپ کی جانب اس کا اشارہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ بس ایک عمومی بات کر رہی تھی، ہاں البتہ شاید اس کے الفاظ کا چناؤ کچھ غیر مناسب تھا۔ آپ میرا تو یقین کریں گے ناں۔۔۔۔۔ میں اس

ساری گفتگو کے دوران وہیں موجود تھی۔۔۔۔۔ ساری بات میرے سامنے ہوئی تھی۔۔۔۔۔ میں چپ کر کے ستارہ کی بات سنتا رہا۔ گویا اسے بھی میرے حال دل کی خبر تھی۔ بس اگر کوئی نہیں جان پایا تو وہ ایک وہی تھا کہ جس کے دم سے یہ سارا فسانہ باقی تھا۔ کتنا فرق تھا دونوں بہنوں میں۔ میں نے ستارہ کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ ”چلیں۔۔۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ ویسے بھی دل کے فیصلوں پر کس کا زور چلتا ہے۔۔۔۔۔ میرا دل بھی بہل جائے گا دھیرے دھیرے۔۔۔۔۔ اس میں گہنا کی کوئی خطا نہیں۔۔۔۔۔ میں ہی اس کے لیے کچھ جذبے پالنے کا مجرم تھا، اور اس جرم کی خوب سزا مل چکی ہے مجھے۔ اب حساب برابر ہو چکا ہے۔۔۔۔۔“

ستارہ نے دکھ سے میری جانب دیکھا ”یقین کریں وہ دل کی بہت اچھی ہے۔ اسے تو آپ کے کسی جذبے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ شاید مجھے بھی نہ پتہ چلتا اگر اس روز آپ کی بہن اور گہنا کی باتیں سن لیتی۔ آیان۔۔۔۔۔ محبت اپنا راستہ خود بتاتی ہے۔۔۔۔۔ اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔۔۔۔“

”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔۔۔۔۔ میرے ہی جذبے میں کچھ کمی ہوگی جو وہ اپنا راستہ نہیں بنایا۔۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔۔ آپ خود کو اتنا نہ الجھائیں۔۔۔۔۔ وقت سارے زخم بھر دیتا ہے۔۔۔۔۔ اور ایک وعدہ کریں مجھ سے کہ مجھ پر جو بھی جتنی آپ وہ گہنا کو کبھی نہیں بتائیں گی۔۔۔۔۔“ ستارہ دھیرے سے بولی ”میں کوشش کروں گی لیکن آپ بھی وعدہ کریں کہ آپ اپنے دل میں ہم لوگوں کے خلاف مزید کوئی ملال نہیں رکھیں گے اور کل ہمارے گھر بھی آئیں گے۔۔۔۔۔“ میں نے اس نازک اندام کا دل ہلکا کرنے کے لیے اس سے وعدہ کر لیا اور وہاں سے چلا آیا۔

راستے میں کچھ دیر کے لیے کیفے فراق پر رکا تو راجہ اور مٹی سے بھی ملاقات ہو گئی۔ مٹی دو دن پہلے ہی ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر واپس آیا تھا اور اب اس کی صحت بھی کافی بہتر لگ رہی تھی۔ دونوں بہت دیر تک مجھ سے گلے شکوے کرتے رہے۔ بالے کو اس کے باپ نے گیراج کا سامان لانے کے لیے دوسرے شہر بھیج رکھا تھا۔ مٹی نے مجھے بتایا کہ اگلے ہفتے شاید ہمارا بی اے کا رزلٹ بھی نکل آئے۔ شکر ہے کہ میں نے اپنے شانوں پر شال ڈال رکھی تھی ورنہ اگر ان کی نظر کرتے کے اندر میرے شانے پر بندھی پٹی پر پڑ جاتی تو ان کے سوالات کا جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ میں نے ناہید کے گھر میں بھی پورا وقت خود کو اسی شال سے ڈھکے رکھا تھا۔ مرزا کی فرمائش پر میں تیسری مرتبہ چائے پی کر اٹھا تو رات گہری ہو چکی تھی۔ یعقوب میٹشن میں داخل ہوئے تو ایک عجیب سی ہل چل محسوس ہوئی۔

میں گاڑی سے اتر کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ موسیٰ کی آواز نے میرے قدم روک لیے۔ ”آگیا شہزادے۔۔۔۔۔ رنگا بھائی تین مرتبہ تیرا پوچھ چکے ہیں۔۔۔۔۔ بڑے مہمان خانے میں وہ تیرا انتظار کر رہے ہیں چل آ جا۔۔۔۔۔ میں تجھے لینے کے لیے ہی آیا تھا۔“

میں موسیٰ کے ساتھ بڑے مہمان خانے کی طرف جاتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ آخر ایسی کون سے خاص بات ہے جس کے لیے مجھے رنگا نے اس وقت خاص طور پر طلب کیا ہے۔ میں مہمان خانے کے ہال میں داخل ہوا تو میرے قدم جم سے گئے۔ اندر سارا رنگا کے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا۔

